شوال المکرم ۱۴۴۱ھ
جون ۲۰۲۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دعوتِ قرآنی کا لُبِّ لُباب
اور داعیانِ حق کو جامع ہدایات
خواتیمِ سُورۃ الاعراف کی روشنی میں
بانیٔ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سُورۃ الفاتحہ وسُورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت 500 روپے

حصہ دوم سُورۃ آلِ عمران تا سُورۃ المائدہ
صفحات 326، قیمت 500 روپے

حصہ سوم سُورۃ الانعام تا سُورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 500 روپے

حصہ چہارم سُورۃ یُونس تا سُورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 550 روپے

حصہ پنجم سُورۃُ مریم تا سُورۃُ السّجدۃ
صفحات 480، قیمت 750 روپے

حصہ ششم سُورۃُ الاحزاب تا سُورۃُ الحجرات
صفحات 484، قیمت 750 روپے

حصہ ہفتم سُورۃُ قٓ تا سُورۃُ النّاس
صفحات 560، قیمت 800 روپے

(مکمل سیٹ: 4300 روپے)

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 69

شمارہ : 6

شوال المکرّم 1441ھ

جون 2020ء

فی شمارہ -/40

(اس شمارے کی قیمت -/80 روپے)

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون

- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت وبنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: +92 322 4585384

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

- **عرضِ احوال** — 5
  - فتنہ قادیانیت اور ہماری دینی جماعتوں کی ذمہ داری — ایوب بیگ مرزا
- **حقیقتِ دین** — 10
  - طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **بیان القرآن** — 39
  - سورۃ الجاثیۃ — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **نشر القرآن** — 61
  - دعوتِ قرآنی کا لُبِّ لُباب اور داعیانِ حق کو جامع ہدایات — ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- **جوہرِ عبادت** — 81
  - **دُعا** — صاحبزادہ خورشید احمد گیلانیؒ
- **مطالعۂ قرآن حکیم** — 89
  - شہادت علی الناس — شجاع الدین شیخ
- **افکار و آراء** — 97
  - آنے والے دور میں عالمی سیاست کا مرکز: اصفہان — انجینئر مختار فاروقی
- **دعوتِ فکر** — 109
  - 'چھوٹے' روزے سے 'بڑے' روزے کی جانب — رانا عرفان علی
- **انوارِ ھدایت** — 114
  - جہنم اور جہنمیوں کے احوال — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ
- **اسلامی نظامِ حیات** — 125
  - عوام کی بنیادی ضروریات کا اہتمام: حکومت کی ذمہ داری — ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ
- **آزادیٔ نسواں** — 142
  - لڑکیوں کی بغاوت: اسباب و علاج (۲) — ابوکلیم مقصود الحسن فیضی
- **تعمیرِ سیرت** — 153
  - کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی! — عتیق الرحمٰن صدیقی
- **حرفِ آرزو** — 159
  - فائنانشل ایمرجنسی کا نفاذ ناگزیر ہے! — حافظ عاطف وحید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فتنہ قادیانیت اور ہماری دینی جماعتوں کی ذمّہ داری

تاریخ برصغیر کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے کہ قادیانیت کا پودا انگریز نے مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کے ذریعے اِس سرزمین میں کاشت کیا‘ پھر اس کو پھلنے پھولنے کے بھرپور مواقع مہیا کیے اور اِس زہریلے پودے کو پروان چڑھانے کے لیے خود اِس کی نگہداشت کی۔ یہ کہنا بھی کوئی انکشاف نہ ہوگا کہ انگریز برصغیر میں مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو اپنے اقتدر کے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ لہٰذا مرزا کو اِس جذبہ کو سرد کرنے کے لیے استعمال کیا گیا‘ جو کہ اُس کے اِس شعر سے بھی واضح ہو گیا ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال!
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

مرزا غلام احمد کے ذریعے یہ کہلوا کر دین اسلام کی بنیاد پر کلہاڑا چلایا گیا کہ (معاذ اللہ!) نبی اکرم محمد مصطفی احمد مجتبیٰ ﷺ آخری نبی نہیں تھے اور اِس مردود نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ دین اسلام کی جڑ اور بنیاد پر حملہ تھا‘ کیونکہ نہ صرف متعدد احادیثِ نبویؐ کے ذریعے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی‘ رسول نہیں آئے گا‘ بلکہ قرآن مجید میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ (الاحزاب: ۴۰)

گویا اللہ تعالیٰ نے خود انسانیت کے لیے نبوت کے سلسلہ کے مکمل اور حتمی خاتمے کا اعلان فرما دیا۔ لہٰذا قادیانی مذہب‘ اسلام سے کس قدر دور ہے اور اِن کے مابین کتنا فاصلہ ہے‘ ہم اِس کی مثال دینے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کہ دنیا کا طول وعرض اِس کی گنجائش نہیں رکھتا۔

پاکستان سے قادیانیوں کی دشمنی اور عداوت صدفی صد قابلِ فہم ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام پاکستان کے قیام کی وجہ جواز بنا‘ لہٰذا قادیانیوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے ہی نئی مملکت کے خلاف سازشیں شروع کر دی تھیں۔ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انگریز برصغیر کو تقسیم کرنے پر رضامند تو ہو گیا لیکن ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان اور بھارت کے

درمیان کشمیر کا تنازعہ چھوڑ گیا۔ اشارۃً عرض ہے کہ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ آنے والے کسی وقت میں پاکستان اور بھارت ایک متحدہ قوت بن جائیں اور یورپ کے لیے خطرہ بن جائیں۔ بہرحال ریڈکلف ایوارڈ میں بددیانتی کا ارتکاب کیا گیا اور مسلمان اکثریتی آبادی کا ضلع گورداسپور بھارت کو دے دیا گیا جو آج بھی بھارت اور کشمیر کے درمیان واحد زمینی راستہ ہے۔ انگریز یہ بددیانتی کسی صورت نہ کر سکتا اگر قادیانی مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتے۔ قادیانی سرکاری کاغذات میں مسلمان تھے۔ آج مسلمان کہلوانے کی رَٹ لگانے والے ان قادیانیوں نے تب حلفیہ کہہ دیا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اگرچہ اُن کے حلفیہ کہنے کی کوئی حیثیت نہیں تھی‘ لیکن انگریز کو جھوٹا جواز مل گیا اور کشمیر کا ایسا تنازعہ پیدا ہوا جو لاکھوں جانیں اور اربوں کھربوں کے مالی وسائل جھونکنے کے باوجود آج بھی امن کے جسد پر ایسا زخم ہے جس سے مسلسل خون بہہ رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد قادیانی اسلام اور پاکستان کے عالمی دشمنوں کی سرپرستی میں مسلسل سازشیں کر رہے ہیں‘ جن کی تفصیل درج کرنے سے ایک ضخیم کتاب وجود میں آ جائے گی۔

۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف پہلی عوامی تحریک چلی‘ بہت جانی و مالی نقصان ہوا۔ لاہور میں مارشل لاء نافذ ہو گیا‘ لیکن تحریک نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ پھر ۱۹۷۴ء میں عوامی دباؤ پر پاکستان کی قومی اسمبلی نے ایک تاریخی فیصلہ دیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کا دن مسلمانانِ عالَم کے لیے بہت بڑی خوشخبری لایا جب پاکستان نے سرکاری طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ یہ بہت بڑا کارنامہ تھا‘ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو مسلمانانِ پاکستان کو حاصل ہوا‘ لیکن جلد بازی میں یا ناسمجھی سے ایک بہت بڑی چوک ہو گئی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ آئین میں انہیں غیر مسلم تو قرار دے دیا گیا اور بعد ازاں تعزیراتِ پاکستان کے تحت تبلیغی سرگرمیوں کی بھی ممانعت کر دی گئی‘ لیکن اگر اُس وقت یہ بھی طے ہو جاتا کہ آئندہ کسی مسلمان کے قادیانی ہونے کی صورت میں اُسے اسلامی ریاست جمہوریہ پاکستان وہ سزا دے گی جو شریعتِ محمدی ﷺ میں کسی مسلمان کو اسلام ترک کرنے پر مقرر ہے‘ یعنی مرتد کی سزا کو تعزیراتِ پاکستان کا حصہ بنایا جاتا‘ تو ایسی صورت میں آج قادیانیت دم توڑ چکی ہوتی‘ اگرچہ اِس سزا کی ایک بار بھی عملدرآمد کی نوبت نہ آتی‘ کیونکہ بعد ازیں قادیانی ہونے والے مسلمان شکم کی غلامی اور نفسانی حرص وہوس کی تکمیل کے لیے مرتد ہوئے‘ جو اُس صورت میں نہ ہوتے۔ بہرحال شاید اللہ تعالیٰ کو اس حوالے سے ہمارا مزید امتحان لینا مقصود ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے ہماری مختلف حکومتیں عالمی دباؤ کا سامنا نہ کر سکنے کی وجہ سے قادیانیوں کے لیے آگے بڑھنے کی کوئی نہ کوئی گنجائش نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ قریباً نصف صدی سے آج تک ہم مسلسل کشکول پکڑے دنیا بھر میں گھومتے پھر رہے ہیں اور جو ہمارے کشکول میں کچھ ڈالتا ہے وہ کچھ مطالبے بھی سامنے رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے حکمران چاہے سول ہوں یا فوجی اکثر برسر اقتدار آنے کے بعد عوامی حمایت کھو دیتے ہیں۔ چنانچہ اُنھیں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے غیر ملکی قوتوں کے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے‘ لہٰذا اُن کا کچھ نہ کچھ جھکاؤ قادیانیوں کی طرف ہو جاتا ہے۔ تیسرا سبب یہ بنتا ہے کہ ہماری پڑھی لکھی ایلیٹ اور مذہب بے زار بیوروکریسی قادیانیوں کی ڈھکی چھپی حمایت اور ختم نبوت کے جاں نثاروں اور جانبازوں کی سرگرمیوں کی مخالفت فیشن کے طور پر کرتی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ فروعی مسئلہ ہے (معاذ اللہ!) وہ قادیانیوں کے حوالے سے عالمی قوتوں کی مخالفت مول لینا ملکی مفاد کے خلاف سمجھتی ہے۔ اور ہماری حکومتوں کا چونکہ بیوروکریسی نے مکمل محاصرہ کیا ہوتا ہے‘ لہٰذا حکومتیں دباؤ میں آ جاتی ہیں‘ کیونکہ اُنھیں صرف اپنے اقتدار سے غرض ہوتی ہے۔

ایک عرصہ سے اسلام دشمن عالمی قوتوں اور مسلمانانِ پاکستان کے درمیان ایک عجیب کشاکش جاری ہے۔ دشمنوں کو اسلام کے شعائر میں سے کسی اور سے اتنی دشمنی نہیں جتنی دشمنی اُنھیں رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک سے ہے اور مسلمانانِ پاکستان کو شعائر اسلام میں سے کسی سے اتنا گہرا تعلق اور محبت نہیں ہے جتنی آپ ﷺ کی ذاتِ مبارک سے ہے۔ نماز نہ پڑھنے والا‘ روزہ نہ رکھنے والا پاکستانی مسلمان بھی حضور ﷺ کے نام پر گردن کٹوانے کے لیے ہر دم ہر لحظہ تیار رہتا ہے‘ صوم وصلوٰۃ کے پابند کی تو بات ہی دوسری ہے۔ اُن کا بس چلے تو ختم نبوت کا انکار کرنے والا ہر شخص زمین کے اُوپر نہیں‘ زمین کے پیٹ میں ہو۔

اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس صورت حال کا محض ماتم کرتے رہیں گے اور یہ دیمک پاکستان کو کھوکھلا کرتی رہے گی؟ اِس حوالے سے یوں تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اِن دشمنانِ اسلام و پاکستان کو اِن کے اصل مقام پر رکھیں‘ یعنی وہ چونکہ آئین پاکستان کے مطابق غیر مسلم اقلیت ہیں لہٰذا غیر مسلم اقلیت بن کر رہیں‘ لیکن اصل ذمہ داری پاکستان کی دینی جماعتوں کی ہے کہ وہ اِس حوالے سے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔ اب تک کی صورتِ حال یہ ہے کہ جونہی قادیانیوں کے حوالے سے کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا ہے‘ دینی جماعتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں‘ اجتماعات کرتی ہیں‘ پریس

کانفرنسوں کا انعقاد کرتی ہیں‘ جس سے وقتی طور پر مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور قادیانیوں کے قدم آگے بڑھانے کی کوشش ناکام ہو جاتی ہے لیکن یہ عارضی حل ہے‘ یہ مرض کا اصل اور مستقل علاج نہیں ہے۔

پاکستان کی اصل مقتدر قوتیں بھی فی الحال سمجھتی ہیں کہ مسلمانانِ پاکستان اس کڑوی گولی کو حلق سے نہیں اُتاریں گے اور عالمی اسلام دشمن قوتوں کو بھی کسی نہ کسی سطح پر پاکستان کی ضرورت رہتی ہے‘ لہٰذا قادیانی پسپا ہو جاتے ہیں۔ لیکن عالمی صورتِ حال کا دقتِ نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہر گزرنے والے دن میں صورتِ حال میں تبدیلی آ رہی ہے‘ پاکستان کمزور اور غیر مستحکم ہو رہا ہے‘ پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ بھارت اسرائیل اور امریکہ کا ابلیسی اتحاد دانت تیز کر رہا ہے۔ ان قوتوں کو ایک اسلامی ملک کا ایٹمی قوت ہونا بُری طرح کھٹک رہا ہے۔ وہ ہر صورت اِس کے ایٹمی دانت توڑنا چاہتے ہیں۔ اگر پاکستان مقروض اور کمزور ہوتا چلا گیا تو مذکورہ دشمن قدم بہ قدم آگے بڑھیں گے۔ وہ ہماری عسکری قوت کے ساتھ ہماری دینی اور روحانی قوت کو بھی کمزور کریں گے۔ بدقسمتی سے بلکہ انتہائی بدقسمتی سے ہماری ناؤ کے ملاح جنہیں ہم ہمیشہ سے پاکستان کی مقتدر قوت کہہ کر پکارتے ہیں‘ اُن کی ساری اور مکمل توجہ صرف اور صرف پاکستان کی ایٹمی قوت کے تحفظ پر مرکوز ہے‘ جبکہ وہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت سے غافل ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ایٹمی قوت کا تحفظ لازماً ہونا چاہیے‘ لیکن ہمیں ایک صدی پہلے علامہ اقبالؒ نے سمجھایا تھا اور خوب سمجھایا تھا ؎

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے!

ہماری رائے میں ہماری ایٹمی قوت بھی اُس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکے گی جب تک ہم ریاستی سطح پر حقیقی طور پر اسلام کی دولت سے مالا مال نہ ہو جائیں‘ کیونکہ وہ نظریۂ پاکستان ہے‘ وہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ سوویت یونین نے اپنی بنیاد کو چھوڑا تھا‘ اپنے بنیادی نظریہ سے دور ہو گیا تھا تو سینکڑوں ایٹم بم رکھنے کے باوجود پاش پاش ہو گیا۔

ساری بحث کے بعد اِس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا کہ قادیانیت کا ناسور ہو‘ سود کا زہر ہو یا عریانی وفحاشی کا سیلاب‘ یا وہ تمام امراض ہوں جو آج پاکستان کو نظریۂ پاکستان کی عملی تعبیر نہ ہونے کی صورت میں لاحق ہیں‘ اُن سب کا صرف اور صرف ایک حل ہے کہ پاکستان کو مکمل طور پر اسلامی نظام یعنی شریعتِ محمدی ﷺ کے تحت چلایا جائے۔ یاد رہے کہ پاکستان کی کوئی سیاسی جماعت

بلا استثناء ملک میں نہ صرف یہ کہ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام نہیں کر سکے گی بلکہ اِس کی طرف سنجیدگی سے قدم بھی نہیں بڑھائے گی‘ یہ کام خالص دینی جماعتوں کی مخلصانہ کوششوں سے ہی ممکن ہوگا۔ چنانچہ انہیں اس کے لیے بھرپور عوامی تحریک اُٹھانا ہوگی۔ اتنی بھرپور‘ اتنی زوردار اور زبردست تحریک کہ مقتدر قوتیں اور اِس ناؤ کے ملاح بھی سمجھیں کہ اب اُس ساحل کا رُخ کرنا ہوگا جہاں کشتی حفاظت سے کنارے لگ سکے گی۔ اور اگر دینی جماعتوں کا رویہ یہی رہا کہ جب مسئلہ کھڑا ہوا تو اکٹھ کر لیا‘ بیان جاری کر دیا‘ کوئی دھمکی دے دی تو پھر غیر اسلامی اور غیر شرعی نظام کی وجہ سے پاکستان روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا جائے گا اور‘ ہمارے منہ میں خاک‘ ایک دن ایسا آ سکتا ہے کہ ہماری ناؤ کے ملاح عالمی سطح پر اُٹھنے والے طوفانی تھپیڑوں کو برداشت نہ کر سکیں اور وہ پاکستان کا جسد بچانے کے لیے پاکستان کی روح کو سرنڈر کر دیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ بے روح جسد اوّل تو دفنا دیا جاتا ہے وگرنہ بدبو دیتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس کے لاشے کا تماشا بنایا جاتا ہے۔

آخر میں ہم دینی جماعتوں کی خدمت میں مکرر عرض کریں گے کہ ایشو کھڑا ہونے پر بیٹھک جمانے سے مسئلہ مستقل طور پر حل نہیں ہوگا۔ قادیانیت ہو یا دوسرے مہلک امراض ان سے قوم کے جسد پر لگا زخم ہرا رہے گا‘ اُس سے خون رِستا رہے گا‘ جو جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ عالمی قوتیں اُس وقت تک ہمارے مقدر سے کھیلتی رہیں گی جب تک تمام دینی جماعتیں مل کر پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لیے جہاد نہیں کرتیں۔ اِن سول اور غیر سول حکمرانوں پر بھروسا نہ کریں جو عالمی قوتوں کے تیور دیکھ کر فیصلے کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ محض دنیوی قوت ہی فیصلہ کن ہوتی ہے۔ ہم دنیوی قوت کے قائل ہیں‘ لیکن روحانی قوت اگر مسلمان کی پشت پر نہ ہو تو دنیوی قوت کچھ کام نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا تحفظ اسلام سے جڑا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو دین صرف اسلام ہے اور یہ کُل زمین اللہ تعالیٰ کی ہے‘ جہاں چاہے گا اسلام قائم کر دے گا‘ لیکن پاکستان اسلام کے بغیر کہیں کا نہیں ہے۔ یہ بات جتنی چاہے تلخ لگے لیکن یہ حقیقت ہے جسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ لہٰذا دینی جماعتوں کا انتہائی کڑا امتحان ہے۔ اُنھیں انتخابی سیاست سے (وقتی طور پر ہی سہی) کنارہ کش ہو کر‘ کشتیاں جلا کر میدان میں آنا پڑے گا۔ تخت یا تختہ دونوں صورتوں میں جیت ہے۔ یہاں بازی ہار بھی گئے تب بھی اُخروی کامیابی تو یقینی ہے۔ ضرورت محض مخلصانہ کوششوں کی ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو حقیقتاً مدینہ جیسی ریاست بنائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ مَا تَصۡنَعُوۡنَ ﴿۴۵﴾﴾

(العنکبوت)

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ کَانَ مَشۡہُوۡدًا ﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ نَافِلَۃً لَّکَ ۫ عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ﴿۷۹﴾﴾ (بنی اسراءیل)

گزشتہ سے پیوستہ

میری گزشتہ روز کی گفتگو فلسفۂ دین کے حوالے سے نماز کی حقیقت اور حکمت پر مشتمل تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمت دین کا اوّلین مسئلہ معرفتِ ربّ ہے اور اسی کو ہم ایمان باللہ کہتے ہیں۔ ایک ہے اللہ کو پہچاننا اور ایک ہے ماننا۔ محض ماننا تو اس وجہ سے بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تو جیسے اس کے والدین اللہ کو مانتے ہیں تو اسی طریقے سے وہ بھی ماننا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے لیے جو شرطِ لازم ہے وہ اس ماننے سے بھی پوری ہو جاتی ہے، لیکن اصل میں جو شے انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتی

ہے اور اس کی شخصیت کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتی ہے، جسے قرآن ''صبغۃ اللہ'' سے تعبیر کرتا ہے، وہ ہے اللہ کو پہچاننا یعنی معرفتِ رب!

میں نے عرض کیا تھا کہ معرفتِ ربّ کے لیے انسان کو صرف تذکر اور یاددہانی کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یہ شے اصلاً فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اس کا شعور سویا ہوا ہے، خوابیدہ ہے، اسے بس activate کرنا ہے اور اس کے لیے ذریعہ ہے تذکر بالقرآن یعنی قرآن کے ذریعے سے یاددہانی حاصل کرنا۔

اس کے بعد انسان کے حکمت قرآنی اور حکمت دین کے دوسرے بڑے مسئلے کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ ایک تو یہ کہ انسان کی فکر، اس کی سوچ، اس کا علم، اس کے نظریات اور افکار صحیح رخ پر پروان چڑھیں، پیش قدمی کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فکر کے ساتھ ذکر بھی موجود رہے۔ اگر اس میں یک رخی آ گئی تو کجی آ جائے گی۔ مولانا روم اور علامہ اقبال کے اشعار کے حوالے سے میں اسے مزید واضح کر چکا ہوں ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کن
فکر اگر جامد بود رو ذکر کن!

اور ؎

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شہنشاہی است!
فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

اس ذکر کا سب سے مؤثر، سب سے عمدہ، سب سے اعلیٰ اور سب سے جامع ذریعہ نماز ہے۔

دوسری ضرورت انسان کے عمل کے درست رہنے کی ہے، بایں طور کہ عمل کج نہ ہو جائے، اس میں افراط و تفریط نہ ہو، عدم توازن نہ ہو اور وہ سیدھے راستے پر گامزن رہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی تین اصطلاحات ہیں: (۱) صراطِ سوی، درمیانہ راستہ (۲) صراطِ مستقیم، سیدھا راستہ، اور (۳) قصد السبیل، وہ راستہ جو انسان کو سیدھا اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس راستے پر انسان کا قدم جما رہے اور وہ

کہیں اِدھر اُدھر کی پگڈنڈیوں پر مڑ نہ جائے۔ نہ وہ نفسِ امارہ سے مرعوب یا مرغوب ہو‘ نہ ماحول کے غلط اثرات سے متاثر ہو اور نہ ہی جذبات کی کسی طوفانی رو کے اندر بہہ جائے۔ اس کے لیے مستقل‘ زندہ‘ بیدار‘ حقیقی تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے اور اس تعلق مع اللہ کا بھی سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے اعلیٰ وسیلہ نماز ہے۔

تیسری چیز جو میں نے عرض کی تھی وہ اصل میں ان سب کا مقصود ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک سطح پر آ کر ذرائع کی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں اور ان سب کا اپنا ایک ہدف اور مقصود ہے۔ اور وہ ہے انسان کی روحانی ترقی‘ جس کے لیے میں نے تقرب الی اللہ کی اصطلاح استعمال کی تھی یعنی اللہ سے قریب سے قریب تر ہوتے چلے جانا۔ پھر یہ قرب کوئی مادی مسئلہ نہیں ہے‘ اس لیے کہ اللہ ربّ العزت اور ہمارے درمیان کوئی زمانی یا مکانی فصل نہیں ہے‘ لیکن یہ کہ ذہول‘ عدم توجہ اور دوسری چیزوں میں دل لگ جانے کی وجہ سے دل میں محبتِ خداوندی کے لیے جگہ نہیں رہتی اور یہ چیزیں انسان کو اپنے رب سے دور کر دیتی ہیں۔ ورنہ پروردگار کی طرف سے تو ہر وقت ایک دعوتِ عام ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں‘ کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے‘ رہروِ منزل ہی نہیں!

اس حوالے سے وہ حدیث قدسی بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً)) (رواہ البخاری) ’’اگر میرا بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہو تو میں ایک گز اس کے قریب ہوتا ہوں‘ اور اگر وہ مجھ سے ایک گز قریب ہوتا ہے تو میں اس سے دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر قریب ہوتا ہوں‘ اور اگر وہ میری طرف چل کر آئے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں‘‘۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف سے تو ہر وقت دعوتِ عام ہے‘ جبکہ ذہول اور عدم توجہی ہماری طرف سے ہے۔ بہرحال اس توجہ الی اللہ اور تقرب الی اللہ کا بھی سب سے اعلیٰ‘ سب سے عمدہ‘ سب سے جامع طریقہ اور ذریعہ نماز ہے۔ یہ ہے میری کل کی گفتگو کا خلاصہ!

طلبِ قرآن کا مفہوم اور اس کی شرائط

اب آتے ہیں آج کے موضوع کی طرف یعنی ’’طالبانِ قرآن اور خادمانِ دین کے لیے نماز کی خصوصی اہمیت‘‘ اور اس پر میں چند باتوں کا اضافہ بھی کروں گا —— سب سے پہلے یہ جانتے ہیں کہ طالبانِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ طالب قرآن سے مراد ہے قرآن مجید سے علم صحیح‘ فہم صحیح اور ہدایت اخذ کرنے کا آرزومند۔ اس کے لیے ذرائع ہیں: قرآن کا پڑھنا‘ قرآن پر غور و فکر‘ سوچ بچار‘ تدبر۔ پھر یہ کہ طالب قرآن کا اصل ہدف کیا ہے اور وہ قرآن سے کیا چاہتا ہے؟ معاذ اللہ‘ کوئی طالب قرآن ایسا بھی ہو سکتا ہے جو صرف اس لیے قرآن کو حفظ کر رہا ہو یا قرآن کو پڑھ رہا ہو کہ اُسے کوئی پیشہ اختیار کرنا ہے۔ اِس وقت اس کو اپنے ذہن سے نکال دیں۔ طلب قرآن سے اصل مراد ہے: قرآن سے ہدایت اخذ کرنا‘ قرآن کے ذریعے اپنے فکر کو جلا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے فکر اور سوچ بچار کی جو صلاحیتیں انسان کو عطا فرمائی ہیں‘ ان کو صحیح رخ پر پروان چڑھانا۔ گویا بات وہی ہو گئی جو کل میں بیان کر چکا ہوں کہ فکر انسانی کے صحیح رخ پر آگے بڑھنے اور پیش رفت کا معاملہ!

اب نوٹ کیجیے کہ اس ہدایتِ قرآنی اور صحیح علم و فکرِ قرآن سے مستفید ہونے کے لیے دو چیزیں شرطِ لازم ہیں:

(۱) تصحیح نیّت: جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا کہ علم دین کے حصول کا ایک محرک یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کہیں خطیب بننا ہے‘ امام لگنا ہے۔ ہمارے ملک کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے تو چاہے کوئی حقیقی اسلامی نظام یہاں نافذ نہیں ہے‘ لیکن مساجد میں خطباء کے باقاعدہ گریڈز مقرر ہیں اور یہ بھی ایک مستقل پیشہ بن گیا ہے۔ بہت سے لوگ اب علم دین اس لیے حاصل کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے دنیوی فائدہ اُٹھا سکیں۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پیش نظر رہنا چاہیے: ((مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ)) (رواہ الترمذی ومرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح) ’’جس نے علم دین اس غرض سے حاصل کیا تاکہ اس کے ذریعے علماء سے مقابلہ کرے گا یا اس کے ذریعے

احمقوں سے حجت بازی کرے گا یا لوگوں کو اپنی جانب مائل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے نارِ جہنم میں داخل کرے گا۔''

علم اور تحصیلِ علم کی تو بڑی فضیلت اور بڑی اہمیت قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا: ((یُوْزَنُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ وَدَمُ الشُّھَدَاءِ، فَیَرْجَحُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ عَلَی دَمِ الشُّھَدَاءِ)) (اخرجہ الدیلمی فی مسند الفردوس) ''روز قیامت علماء کے قلم کی سیاہی اور شہداء کے خون کو تولا جائے گا تو علماء کے قلم کی سیاہی شہداء کے خون سے زیادہ وزنی ہو جائے گی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ((تَدَارُسُ الْعِلْمِ سَاعَۃً مِنَ اللَّیْلِ خَیْرٌ مِنْ إِحْیَائِھَا)) (رواہ الدارمی، باب مذاکرۃ العلم، روای: ابن عباس رضی اللہ عنہما) ''رات میں ایک گھڑی پڑھنا پڑھانا ساری رات عبادت کرنے سے افضل ہے''۔ یعنی ایک شخص ساری رات جاگتا ہے اور نوافل ادا کرتا ہے، اس کے مقابلے میں ایک شخص کچھ دیر علم کی تدریس یا تحصیل کرتا ہے تو یہ افضل ہے۔ اس علم کا یہ مقام ہے۔ لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرما دیا کہ اگر علم حاصل کرنے کا مقصد یہ ہو کہ انسان علماء کی محفل میں بیٹھ سکے، ان کی اصطلاحات میں گفتگو کر سکے، یہ نہ محسوس ہو کہ یہ شخص ہمارے مابین بیٹھنے کے قابل نہیں ہے اور یہ ہماری اصطلاحات سے واقف نہیں ہے، اس لیے کچھ چیزوں کا علم حاصل کر لیا جائے، یا مقصد یہ ہو کہ بے علم لوگوں پر انسان دھونس جما سکے، ان پر اپنے علم کا رعب گانٹھ سکے، یا پھر اپنے علم کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا مقصد ہو تو اس کے لیے شدید وعید ہے اور ایسا شخص اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا رہا ہے۔

اس کے برعکس ایک حدیث یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ جَاءَہُ الْمَوْتُ وَھُوَ یَطْلُبُ الْعِلْمَ لِیُحْیِیَ بِہِ الْإِسْلَامَ فَبَیْنَہُ وَبَیْنَ النَّبِیِّیْنَ دَرَجَۃٌ وَاحِدَۃٌ فِی الْجَنَّۃِ)) (رواہ الدارمی والطبرانی) ''جس شخص کو موت آئی اس حال میں کہ وہ علم کی تحصیل کر رہا تھا تاکہ وہ اس کے ذریعے سے اسلام کو زندہ کرے تو ایسے شخص اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق رہ جائے گا''۔ معلوم ہوا کہ طلب

علم میں تصحیح نیت کی بڑی اساسی اہمیت ہے اور تصحیح نیت کے لیے لازم ہے دوامِ ذکر الٰہی اور دل کا اللہ کے ساتھ متعلق رہنا۔

مجھے یہاں حدیث کا ایک اور جملہ یاد آ گیا۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے سات افراد کا تذکرہ فرمایا جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن خاص اپنے سائے تلے جگہ دے گا، جس دن کسی کے لیے اس کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا، ان میں سے ایک شخص وہ بھی ہے: ((وَرَجُلٌ قَلْبُہُ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسَاجِدِ)) (صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ) ''وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں ہی اٹکا رہتا ہے''۔ وہ اگرچہ اپنی ضروریات، معاش کی بھاگ دوڑ اور دوسری ذمہ داریوں کے لیے باہر نکلتا ہے، لیکن دل وہیں اٹکا رہتا ہے کہ جیسے ہی اذان کی آواز آتی ہے تو فوراً مسجد کی طرف لپکتا ہے۔ جیسے مچھلی کو اگر آپ پانی سے نکالیں گے تو تڑپے گی، اسی طرح ایک حقیقی مسلمان کا مسجد سے باہر والا وقت ماہیٔ بے آب والی کیفیت میں گزرتا ہے۔

اس ضمن میں یاد رکھیں کہ دل اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ معلق نہ رہے، جڑا نہ رہے تو نیت میں فساد آ جائے گا۔ نیت میں فساد کے لیے شیطان دل میں پھونکیں مارنے لگتا ہے اور ذکر سے خالی قلب کے بارے میں یہ حدیث کل میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ معلوم ہوا کہ قرآن مجید سے صحیح فکر، صحیح علم، صحیح سوچ اور حقیقی ہدایت کے اخذ کرنے کے لیے تصحیح نیت شرطِ لازم ہے اور اس کے لیے لازم ہے دوامِ ذکر اور دوامِ ذکر کا سب سے اعلیٰ، سب سے عمدہ اور سب سے جامع طریقہ نماز ہے۔

کل میں نے ذکر کی اقسام بتائی تھیں: ذکرِ غیابی، ذکرِ حضوری، پھر ایک ذکر صرف ذہنی و فکری ہے اور اس کے ساتھ ایک ذکر وہ ہے جس میں عمل کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ ذکر کے یہ جملہ پہلو نماز میں جمع ہو گئے، چنانچہ نماز ذکرِ غیابی بھی ہے، ذکرِ حضوری بھی ہے، خطاب بھی ہے، دعا بھی ہے، مخاطبہ و مکالمہ بھی ہے اور ہم کلامی بھی ہے۔ اسی لیے نماز کو مؤمنین کی معراج کہا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس میں نہ صرف ہم ذکرِ لسانی کر رہے ہوتے ہیں، بلکہ رکوع اور سجود کے ذریعے عملاً ہم اللہ کی تعظیم بھی کر رہے ہوتے ہیں۔

اب تک کی میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ طالب قرآن یعنی صحیح معنی میں قرآن کی ہدایت سے استفادہ کے لیے شرطِ اوّل‘ جو شرطِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے‘ وہ ہے تصحیح نیت۔ اس کے لیے ضروری ہے دوامِ ذکر اور ذکر کا جامع ترین‘ بلند ترین طریقہ اور ذریعہ نماز ہے۔

(۲) علم کے ساتھ عمل بھی: طالب قرآن کے لیے ایک دوسری شرط بھی ہے اور وہ شرط یہ ہے کہ جیسے جیسے علم و ہدایت حاصل ہو‘ اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی فوراً شروع ہو جائے۔ ایک بات سمجھ میں آ گئی‘ ذہن پر منکشف ہو گئی‘ دل نے گواہی دے دی کہ ہاں بات ٹھیک ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

میری فطرت یہی کہہ رہی ہے اور مجھے اپنے اندر سے بھی اسی بات کی گواہی مل رہی ہے‘ گویا ذہن اور قلب کا متفقہ فیصلہ ہو چکا کہ یہ صحیح ہے تو اب فوری طور پر عمل اس رخ پر مڑے۔ اور اگر انسان پہلے سے ہی اس پر عامل ہے تو مزید انشراح و انبساط ہو گا‘ اس پر مزید اعتماد پیدا ہو گا‘ مزید اطمینان حاصل ہو گا۔ یہی وہ لفظ ہے جو نفسِ انسانی کی بلند ترین کیفیت کے لیے آیا ہے:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝۲۷ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝۲۸﴾ (الفجر)

”اے نفسِ مطمئنّہ! اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اُس سے راضی‘ وہ تم سے راضی۔“

چنانچہ اگر پہلے سے اس پر عامل ہے تو مزید اطمینان اور انشراح پیدا ہو گا اور اگر نہیں ہے تو اب اس کی طرف رخ کو موڑنا لازم ہے۔ یہ نہیں کریں گے تو وہی فصل (gap) شروع ہو جائے گا: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ (الصف) ”کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟“ یہاں سے جو فصل شروع ہو گا —— اسے انسان کے فکر و عمل کا فاصلہ کہہ لیجیے‘ علم و عمل کا فصل کہہ لیجیے یا قول و فعل کا تضاد کہہ لیجیے —— یہی آگے بڑھ کر وہ روگ اور

مرض بن جائے گا جس کی طرف قرآن بار بار نشان دہی کرتا ہے: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا﴾ (البقرۃ:۱۰) ”اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے تو اللہ نے ان کے روگ میں اضافہ کر دیا“۔ پھر یہی روگ ترقی کر کے انسان کو اس مقام تک لے جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا اور صریحاً کفر سے بھی زیادہ مبغوض اور ناپسند ہے‘ اور وہ ہے نفاق۔

دوامِ صلاۃ اور نمازِ فجر

اب عمل کے لیے بھی تعلق مع اللہ لازم ہے اور اس کا ذریعہ وہی ذکرِ دوام ہے جس کی بلند ترین اور جامع ترین صورت نماز ہے۔ ابتدا میں مَیں نے سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیات تلاوت کی تھیں جن میں اسی کی طرف اشارہ ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ﴾ ”نماز کو قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے سے لے کر رات کے گہرے ہو جانے تک اور قرآن کا پڑھا جانا فجر کے وقت“۔ یہ ہے دوامِ صلاۃ۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کیجیے کہ نماز کو قائم رکھو ﴿لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾۔ سورج جب نصف النہار پر ہو کر ذرا سا مغرب کی طرف ڈھل جائے تو یہ اس کا دلک ہے‘ دُلُوكِ الشَّمْس اور جب سورج غروب ہو گیا اور اس کے بعد رات تاریک ہو گئی‘ پھر تاریکی کا پردہ خوب گہرا دبیز ہو گیا تو یہ غَسَقِ الَّيْل ہے۔ یہاں سے وہاں تک تو نماز کو قائم رکھنا ہے۔ اس کی کچھ نہ کچھ کیفیت ذاتی طور پر انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے۔ خاص طور پر سردیوں کے موسم میں جب دن چھوٹے ہوتے ہیں‘ بایں طور کہ ذرا سا سورج ڈھلا ہے تو ظہر‘ بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزرے گا تو عصر‘ پھر ایک یا سوا ایک گھنٹہ گزرا تو مغرب‘ پھر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد عشاء کا وقت ہو جاتا ہے۔

اس صورتِ حال میں جو شخص واقعتاً نماز کا پابند ہو تو اس کے لیے مسجد کی طرف مسلسل آمد و رفت ہے‘ گویا وہ نماز ہی میں ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی ایک نماز کے دوران سلام پھیرتے ہیں اور پھر نماز شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً ظہر کی نماز میں آپ نے چار رکعات سُنّتِ مؤکّدہ ادا کر کے سلام پھیر لیا تو اب آپ نماز میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد پھر آپ جماعت میں چار رکعات فرض کے لیے کھڑے ہوئے تو پھر نماز میں آ گئے۔ اس کے

بعد پھر سلام پھر گیا تو اب آپ نماز میں نہیں ہیں‘ لیکن ساتھ ہی آپ دو رکعت سُنّتِ مؤکّدہ ادا کرنے کے لیے پھر نماز میں آ گئے۔ درحقیقت یہ پوری نمازِ ظہر ہے‘ جس میں آپ نماز سے نکل کر بھی نماز میں ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے وقفے وقفے سے مسجد سے نکلنا تو ہے‘ لیکن بعینہٖ اسی تشبیہہ کو سامنے رکھیں تو گویا نماز مسلسل قائم ہو رہی ہے دُلُوكِ الشَّمْس سے لے کر غَسَقِ الَّيْل تک۔

اس کے بعد خاص طور پر فجر کی نماز کا علیحدہ سے تذکرہ کیا گیا ہے‘ اس لیے کہ اس میں طولِ قنوت یعنی زیادہ دیر تک کھڑے رہنا اور لمبی قراءت ہوتی ہے۔ یہ گویا نمازِ فجر کے لوازم میں سے ہیں‘ اسی لیے آیت زیر مطالعہ میں ’’وَصَلٰوۃ الفجر‘‘ نہیں بلکہ ’’وَقُرْاٰنَ الْفَجْر‘‘ کہا گیا کہ ’’التزام رکھو فجر میں قرآن کا‘‘۔ یعنی فجر میں قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے‘ زیادہ سے زیادہ اس کی تلاوت کرنے کا حکم دیا گیا۔

آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾﴾ ’’یقیناً فجر کے وقت قرآن کا پڑھا جانا مشہود ہے‘‘۔ مَشْهُوْدًا کے بارے میں کئی تفصیلی اقوال ہیں۔ مشہود کے ایک معنی یہ ہیں کہ قلب حاضر ہوتا ہے‘ استحضار ہوتا ہے‘ طبیعت تر و تازہ ہوتی ہے‘ تکان نہیں ہوتی‘ کسل نہیں ہوتا۔ رات بھر آپ نے نیند لی ہے تو اب آپ تر و تازہ ہیں‘ آپ کے تمام قوائے باطنی اور اندرونی صلاحیتیں مکمل بیدار ہیں اور وہ وقت گویا قرآن میں موجود چیزوں کے استقبال (reception) کے لیے بہترین اور سازگار ماحول ہے۔ مشہود کے حوالے سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ فجر کی نماز میں وہ فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں جن کی ڈیوٹی رات کے وقت ہوتی ہے —— ابھی off ہونے سے پہلے انہیں فجر کی نماز بھی ساتھ پڑھنی ہے —— اور وہ فرشتے جنہوں نے دن کا چارج سنبھالنا ہے‘ وہ بھی پہلے آ جاتے ہیں تاکہ فجر کی جماعت میں شریک ہو سکیں۔

بہرحال یہ مشہود کے مختلف اقوال ہیں‘ لیکن میں اس وقت توجہ دلا رہا ہوں کہ طالب قرآن کے لیے دو شرطیں ہیں: تصحیح نیت اور علم اور عمل میں کسی فرق و تفاوت یا تضاد کا پیدا نہ ہونا۔ ان دونوں کے لیے لازمی ہے دوام ذکر اور اس کا اہم ترین وسیلہ اور ذریعہ

نماز ہے۔ اب اس کے ساتھ جوڑیے اُس پہلی بات کو جو کل میں نے کہی تھی اور آج بھی اسے دہرایا کہ معرفتِ رب کے لیے سب سے بڑا ذریعہ ذکرِ مجسم ہے اور وہ قرآن ہے۔ اس اعتبار سے گویا نمازِ فجر کا پروگرام دو آتشہ ہو گیا۔ اب یہ صرف صلاۃ نہیں ہے‘ بلکہ اس کے ساتھ قرآن کو بھی جوڑ دیا گیا ہے جو مجسّم ذکر ہے اور جو معرفتِ ربّ کا سب سے جامع اور بلند ذریعہ ہے۔

اگلی آیت میں اس سے اگلی منزل کا بیان ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں تو فرض نمازوں کا ذکر آ گیا‘ یعنی ظہر سے عشاء تک اور پھر فجر اور اب اگلی آیت میں اس سے اگلی منزل یعنی نوافل کا بیان ہے: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ﴾ ’’اور رات کے ایک حصے میں بھی جاگا کرو اس (قرآن) کے ساتھ‘ یہ اضافی چیز ہے آپؐ کے لیے‘‘۔ یعنی یہ جو فجر کا پروگرام ہے‘ اس کو دو آتشہ سے سہ آتشہ اگر کرنا چاہتے ہو تو اب رات کے ایک حصے میں اپنے آرام میں سے کٹوتی کرو اور اُس وقت خاموشی سے اور پُرسکون انداز میں ربّ کے حضور کھڑے رہو۔ اس وقت نہ کوئی نہ دیکھنے والا ہے اور نہ کسی طرح کی کوئی خلل اندازی (disturbance) ہے۔ براہِ راست بندے اور ربّ کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسی فجر کی کیفیت کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ کر کے اس سے استفادہ کرو۔

اس سب کا حاصل اقبال کے اس شعر میں ہے: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

جب یہ قرآن کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو اس کے اندر تبدیلی آ جاتی ہے۔ اندرونی کیفیات‘ اندرونی احساسات‘ اندرونی میلانات‘ اندرونی رجحانات —— انہی کو ہم کہیں گے اقدار (values) —— میں انقلاب آ جاتا ہے۔ اور جب یہ انقلاب اندر سے آئے تو پھر یہ نہایت محکم‘ نہایت پائیدار اور پرتاثیر ہوتا ہے کہ ایک فرد کے انقلاب سے ایک عالمی انقلاب کا پراسیس شروع (inishiate) ہو سکتا ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے‘ دیے سے دیا روشن ہوتا ہے‘ اسی طریقے سے ایک شخص کے اندر یہ کامل

انقلاب انقلابی پراسیس کو inishiate کر دے گا۔ تو علامہ اقبال کے الفاظ ''جہاں دیگر شود'' کے دو حصے ہو گئے۔ ایک تو اس شخص کے لیے زمین و آسمان بدل گئے۔ پہلے کچھ اور نظریات تھے اب کچھ اور نظریات ہیں' پہلے نقطہ نظر اور تھا اب اور ہے۔ یعنی اس شخص کی پوری دنیا بدل گئی اور دوسرا یہ کہ اس دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے عمل کا بھی آغاز ہو گیا۔

خدمتِ دین کا مفہوم

اب آیئے آج کے عنوان کے دوسرے حصے کی طرف کہ خادمانِ دین کے لیے نماز کی کیا اہمیت ہے۔ یہاں بھی پہلے ہمیں define کرنا ہو گا کہ خادمانِ دین سے مراد کیا ہے اور خدمت دین کسے کہتے ہیں؟ ایک تو ہم اپنے بوڑھے والدین کی بھی خدمت کرتے ہیں۔ اس پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا ہے جو مولانا روم نے بات کو سمجھانے کے لیے حکایت کے پیرائے میں لکھا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کہیں سے گزر رہے تھے تو انہوں نے ایک چرواہے کو دیکھا کہ وہ جنگل بیابان میں تنہائی میں مناجات کر رہا تھا' اللہ سے ہم کلام تھا کہ اے ربّ! اگر تو میرے سامنے آ جائے تو میں تیرے پاؤں دھوؤں' تیرے پاؤں دباؤں' تیرے سر میں سے جوئیں نکالوں' تیرا سر دھوؤں۔ اس کے ذہن میں خدمت کا یہی تصور تھا۔ اس کا کوئی بزرگ' بوڑھی والدہ' بوڑھا والد یا کوئی چودھری ہو گا جو اس سے یہ خدمتیں لیتا ہو گا تو اس کے ذہن میں خدمت کا یہی ایک تصور تھا۔ چنانچہ اپنے اس محدود ذہن میں وہ یہی چیزیں اللہ کو آفر کر رہا تھا۔ اس پر مجھے اقبال کا وہ شعر یاد آ رہا ہے کہ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں!

یہ ایک جذبہ ہے کہ اللہ سامنے ہو تو ہم کیا کریں گے۔ ہر شخص اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچے گا کہ وہ کیا کرے گا۔ اس غریب چرواہے نے بھی اپنی ذہنی سطح کے مطابق سوچا کہ اگر اللہ اس کے سامنے ہو گا تو وہ یہ کام کرے گا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے ڈانٹ دیا کہ یہ کیا کفر بک رہے ہو! اب وہ ایک خاص کیفیت میں تھا' حضرت موسیٰؑ کی بات سن کر اس نے چیخ ماری' کپڑے پھاڑے اور نکل گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے فرمایا:

اے موسیٰ تو نے یہ کیا کیا' میرا یہ بندہ اپنے ذہن کے مطابق مجھ سے ہم کلام تھا' تم نے ہمارا یہ تعلق توڑ دیا!

تُو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی!

ہم نے تمہیں لوگوں کو ہم سے جوڑنے کے لیے بھیجا ہے' نہ کہ کاٹنے کے لیے۔

بہرحال یہ بات اس لیے یاد آ گئی کہ خدمت دین کا کیا مقام ہے اور ہم اللہ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں' اللہ کے رسول ﷺ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں اور اللہ کے دین کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے جان لیجیے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خدمت کے لیے لفظ ''نصرت'' قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (الصف:۱۴) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کے مددگار بن جاؤ' جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے کہا تھا حواریوں سے کہ کون ہے جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنے؟'' اسی طرح سورۃ الحدید میں فرمایا: ﴿وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ﴾ (آیت ۲۵) ''اور اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں (اس کے وفادار بندے) جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں غیب میں ہونے کے باوجود''۔ چنانچہ نصرتِ خدا اور رسولؐ تو قرآن کی اصطلاح ہے۔

نصرتِ خدا اور نصرتِ رسولؐ کا مفہوم

اب دیکھتے ہیں کہ نصرتِ خدا اور نصرتِ رسولؐ سے کیا مراد ہے؟ یہ سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ اسی کا نام ہو گا خدمتِ دین۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ طالب قرآن کے لیے دو شرطیں ہیں: تصحیح نیت اور علم و عمل کے اندر توافق' ہم آہنگی۔ اسی طرح خدمت دین کے بھی دو درجے ہیں۔

(۱) دعوتِ دین: اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا' سوئے ہوؤں کو جگانا' نیند کے ماتوں کو ہوشیار کرنا' بھولے اور بھٹکے ہوئے راہی کو نشاندہی کر کے صحیح راستے کی طرف بلانا۔ یہ ہے دعوتِ دین اور اللہ کے راستے کی طرف بلانا۔ سورۃ النحل میں فرمایا: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (آیت ۱۲۵)
''بلاؤ اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے بحث کیجیے بہت اچھے طریقے سے''۔ کہیں مجادلہ اور جھگڑا بھی کرنا پڑ جائے تو وہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں ہونا چاہیے۔ کچھ ضدی آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ مناظرہ اور مجادلہ کا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے' لیکن اس موقع پر بھی تمہارا طرزِ عمل نہایت عمدہ اور اچھا ہونا چاہیے۔ یہ دعوتِ دین' خدمتِ دین کی پہلی منزل ہے۔

(۲) اقامتِ دین: خدمتِ دین کی دوسری منزل اقامتِ دین ہے یعنی دین کو قائم کرنا۔ اسی کو ہم آج کل ایک نئی اصطلاح کے حوالے سے تعبیر کر رہے ہیں: اسلامی انقلاب' یعنی پورے نظام کو بدل دینا۔ اس وقت کے نظام میں جو جو کجی ہے' اللہ سے دوری ہے' دین سے بُعد ہے' ظلم ہے' ناانصافیاں ہیں' استحصال ہے' ان سب کا قلع قمع کر کے' جیسے ایک فرد اللہ کا بندہ بن جائے ایسا ہی پورا نظام اللہ کی بندگی میں آ جائے۔ یہ ہے اقامتِ دین اور اس کے لیے جِدّوجُہد' محنت' جان اور مال کا کھپانا' جہاد بالمال والنفس یا انفاقِ مال اور بذلِ نفس ضروری ہے۔

اب یہ اصطلاحات ہیں۔ جہاد کے معنی کشاکش اور رسّہ کشی کے ہیں۔ ایک طرف وہ ہیں جو باطل کے علمبردار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ باطل نظام یہاں پر قائم رہے' یا کوئی اور ہیں جو کسی اور باطل کے پیروکار ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ باطل نظام یہاں بھی آ جائے۔ مثلاً اگر جاگیرداری اور سرمایہ داری کا باطل نظام چل رہا ہے تو خارج میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس کو ملیامیٹ کر کے کمیونزم کا باطل نظام لانا چاہتے ہیں۔ تو دو قوتیں ہو گئیں۔ ایک وہ جو status quo برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ جو نظام رائج ہے وہی رہے۔ جاگیردار اور سرمایہ دار تو یہی چاہیں گے کہ نظام بالکل نہ بدلے' جیسا ہے ویسا ہی رہے' اس لیے کہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ انہیں وہاں مراعات ملی ہوئی ہیں' ان کی حیثیتیں ہیں۔ اسی طرح جہاں قبائلی نظام ہے وہاں قبائلی سردار کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ چنانچہ ایک قوت تو وہ ہے جو چاہتی ہے کہ نظام برقرار رہے اور وہ قوت ہر اس قوت کے

مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتی ہے جو کسی نوعیت کی بھی تبدیلی لانا چاہے۔ پھر یہ کہ تبدیلی کا بھی ایک دوسرا نقطہ نظر موجود ہے۔ کمیونزم ہے' اس کے ماننے والے' اس کے چاہنے والے' اس کے لیے محنت کرنے والے' جِدّوجُہد کرنے والے بھی میدان میں ہیں۔ اس صورتِ حال میں جو اللہ کے چاہنے والے' اللہ کے دین کے ماننے والے' اللہ کے دیے ہوئے نظام کو برپا کرنے کی جِدّوجُہد کریں گے' تو رسّہ کشی ہو گی' کشاکش ہو کر رہے گی۔

اس کشاکش کے لیے قرآن مجید نے دو اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ پہلی جہاد ہے اور جہاد میں دو چیزیں کھپیں گی' جان اور مال۔ تو اس حوالے سے پہلی اصطلاح ہوئی: جہاد بالمال والنفس۔ دوسری اصطلاح ہے انفاق' اور انفاق کے معنی ہیں: کھپا دینا' خرچ کر دینا۔ اب اس میں بھی دو چیزیں ہیں۔ جان کا کھپانا اور مال کا کھپانا۔ تو اب اصطلاح یوں بنے گی: انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔

خدمتِ دین کے لیے صبر و مصابرت لازم

چنانچہ خدمتِ دین سے مراد ہے جہاد اور انفاق' اور اس کے لیے لازم ہے مسلسل جِدّوجُہد' مسلسل کشاکش' مسلسل کشمکش' مسلسل قربانی' مسلسل مقابلہ۔ اس کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح ہے: صبر و مصابرت۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰﴾
''اے اہلِ ایمان! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ خود صبر کرو' ڈٹے رہو' جمے رہو' ہر نوع کی مخالفت کو جھیلو' تکالیف کو برداشت کرو' جو مصیبت آئے اُسے جھیلو اور جو قربانی دینی پڑے دو۔ یہ ہے صبر و مصابرت —— صَابِرُوْا باب مفاعلہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ تمہارے مقابلے میں تمہاری مخالف قوتیں جو صبر کر رہی ہیں' ان کے صبر پر بازی لے جاؤ۔ تمہارے مخالف بھی تو صبر کر رہے ہیں۔ ابوجہل نے بھی گردن کٹوائی کہ نہیں کٹوائی؟ اپنے باطل دین اور باطل عقائد کے لیے چڑھ کر کے آئے کہ نہیں آئے؟ اب اگر تمہارا صبر ان کے صبر سے بڑھ کر نہیں ہو گا یا تمہارا صبر ان کے صبر کو مات نہیں دے گا تو تمہاری بازی مات ہو جائے

گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو کچھ اصولوں پر بنایا ہے۔ اس کی خصوصی نصرت اور مدد اسی وقت آتی ہے جب اس کے بندے ثابت کر دیں کہ انہوں نے اپنا سب کچھ لگا دیا' کھپا دیا اور انہوں نے کسی چیز کو بچا کر نہیں رکھا ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے' ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

اگر لوگ یہ ثابت کر دیں تو پھر اللہ کی نصرت آتی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ ''کب آئے گی اللہ کی مدد؟ آگاہ ہو جاؤ' یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔''

صبر و مصابرت کا جامع ذریعہ: نماز

آیت زیر مطالعہ میں اصطلاح استعمال ہوئی: صبر و مصابرت' اور اس کو اگر ایک لفظ میں ادا کریں تو وہ ہے: استقامت یعنی کھڑے رہنا' ڈٹے رہنا' جمے رہنا۔ اب سوال یہ ہے کہ صبر کہاں سے ملتا ہے اور استقامت کے لیے source of strength کیا ہے؟ تو اس کے لیے قرآن مجید میں دو مرتبہ وہی بات آئی ہے کہ اس کا جامع ترین ذریعہ نماز ہے۔

بنی اسرائیل سابقہ اُمّتِ مُسلمہ تھی' انہیں معزول کر دیا گیا اور مسلمان اُمّتِ مُسلمہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ پھر بنی اسرائیل کا قبلہ منسوخ ہوا اور کعبہ اُمّتِ مُسلمہ کا مرکز اور قبلہ قرار پایا۔ اب معزول ہونے والی اُمت میں سے کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن میں حق کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت باقی تھی۔ ایک تو ان سے خطاب کیا گیا ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں۔ پہلے مثبت انداز میں دعوت ہے اور آگے پھر تنقید شروع ہو جاتی ہے کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں' تمہاری یہ بداعمالیاں ہیں۔ دعوت کا آغاز ہوتا ہے: ﴿یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾﴾ ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تا کہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔ اور صرف مجھ ہی سے ڈرو'' —— سورۃ المائدۃ کے شروع میں اہل ایمان کو بھی

ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ﴾ ''اے ایمان والو! اپنے عہد کو پورا کرو'' —— لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک نئی نبوت اور ایک نئی رسالت کو تسلیم کر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بنی اسرائیل میں تعصب پیدا ہو چکا تھا' عصبیت پیدا ہو چکی تھی' اپنی برتری کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ اب ایک اُمّی قوم میں اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو کھڑا کر دیا تو ان کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج اور مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کو آسان بنانے کے لیے اس رکوع کے آخر میں فرمایا: ﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ ''اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے''۔ گویا یہ صبر اور صلاۃ جڑے ہوئے اور باہم لازم و ملزوم (inseparable) ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے بعد تقریباً چودہ رکوعوں میں بنی اسرائیل پر بہت ہی طویل فردِ قرارداد جرم عائد کی گئی جس کی وجہ سے وہ اس منصبِ جلیلہ سے معزول کیے گئے۔ پھر بات آتی ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور پھر تحویلِ قبلہ کی۔ اور اس کے بعد اب نئی اُمت جو اس منصب پر فائز ہوئی ہے' اس سے خطاب آغاز ہوا اور اس کے شروع میں ہی فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ ''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ جان لو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ یہاں اہل ایمان سے بھی وہی بات بیان ہوئی جو پہلے بنی اسرائیل سے بیان ہو چکی تھی' اس لیے کہ دین تو ایک ہی ہے۔ دین کی بنیادی تعلیمات ایک ہیں' دین کی حکمت ایک ہے' بس دین کے ظاہری اعمال کی صورتوں میں کچھ فرق واقع ہوا ہے۔ نماز کی شکل بنی اسرائیل میں کچھ اور تھی اور اب ہمارے ہاں کچھ اور ہے۔ لیکن جہاں تک حکمت' فلسفے' دین کے مقاصد' دین کی اساسات' دین کی فکری بنیادوں کا تعلق ہے تو یہ ایک ہی ہیں اور دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے۔

اس کے علاوہ میں نے ابتدا میں سورۃ العنکبوت کی ۴۵ ویں آیت تلاوت کی تھی:

﴿اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾

سورۃ العنکبوت سن ۵ نبوی میں نازل ہوئی ہے۔ یوں سمجھئے کہ جب حضور اکرم ﷺ پر وحی شروع ہوئی تو وہاں سے نبوت کا پہلا سال شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تقریباً تیرہویں سال میں جا کر ہجرت ہوئی تو وہاں سے سن ہجری شروع ہو گا‘ جو اب ۱۴۱۰ھ ہے۔ یوں سمجھئے کہ آج سے ۱۴۱۸ قمری برس پہلے یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ یہ وقت وہ تھا جب مکہ میں اہل ایمان کو شدید مصائب‘ تشدد اور تعذیب سے سابقہ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بری طرح مارا جا رہا تھا۔ بالخصوص ایک تو وہ نوجوان جو اپنے بزرگوں کے رحم و کرم پر تھے اور دوسرے غلام جو اُن کی ملکیت تھے‘ ان کے ساتھ تو وہ جو چاہیں کر گزریں۔ اپنی اولاد کو بھی وہ تشدد و تعذیب کا نشانہ بنا رہے تھے‘ لیکن غلاموں کو تو وہ ہلاک کر دیتے تھے۔ جیسے ابوجہل نے حضرت یاسر اور ان کی اہلیہ حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہما دونوں کو بے دردی سے شہید کر دیا۔ یہ جو شدید دور تھا جس میں صبر و مصابرت کی بڑی سخت ضرورت تھی اور اہلِ ایمان کے صبر کا بڑا عظیم امتحان تھا‘ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ ان کیفیات میں صبر و مصابرت کے لیے تمہارا سہارا‘ تمہارے لیے ذریعہ قوت (source of strength) اور اوّلین ہدایت یہ ہے:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ﴾ ’’پڑھو اُس کو جو نازل کی گئی تمہاری طرف کتاب (یعنی قرآن) اور نماز کو قائم کرو‘‘۔ دیکھئے یہ وہی بات ہو گئی کہ قرآن اور نماز کو جب یکجا کر دیا جائے تو اب یہ دو آتشہ ہو گئے۔ ایک طرف مجسّم ذکر قرآن ہے تو اس کے ساتھ ذکر الٰہی کا بلند اور جامع ترین ذریعہ نماز ہے۔ جیسے ماقبل بیان کردہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات میں تھا:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝۷۸ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۡ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝۷۹﴾

البتہ یہاں ترتیب اس کے برعکس ہے۔ وہاں پہلے نماز کا ذکر ہے اس کے بعد قرآن کا‘ جبکہ یہاں پہلے قرآن کا ذکر ہے اور بعد میں نماز کا۔

سورۃ العنکبوت کی زیر مطالعہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ﴾

’’اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے‘‘۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝۴۵﴾ ’’اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو!‘‘

کل میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اور آج جس کا خلاصہ میں نے آغاز میں دہرایا ہے‘ یہ گویا نہایت جامع الفاظ میں اللہ کی طرف سے اس کی تعبیر ہے کہ اللہ کا ذکر سب سے بڑی شے ہے۔ اس لیے کہ حکمت کا پہلا مرحلہ معرفتِ ربّ ہے اور اس کے لیے تذکّر بالقرآن ضروری ہے۔ اس کا دوسرا مرحلہ فکر صحیح کی طرف پیش قدمی اور عمل صحیح کا برقرار رہنا اور روحانی ترقی ہے۔ اس کے لیے بھی دوامِ ذکر ضروری ہے اور ذکر کی بلند ترین اور جامع ترین صورت نماز ہے۔

اب ہم اپنی گفتگو کی طرف واپس چلتے ہیں کہ خدمت دین کے دو درجے ہیں: دعوتِ دین اور اقامتِ دین یا اسلامی انقلاب یا دین کے غلبے کی جدوجہد۔ اور اس کے لیے ہر قدم پر صبر و مصابرت اور تعلق مع اللہ کی ضرورت ہے‘ جس کا ذریعہ نماز اور قرآن ہے اور جہاں یہ دونوں جمع ہو جائیں تو وہ نورٌ علیٰ نور ہے۔

تعمیرِ سیرت و کردار میں نماز کی اہمیت

اب تک کی میری گفتگو آج کے عنوان کے حوالے سے تھی‘ اب آگے چلتے ہیں اور یہ میری گفتگو کا آخری حصہ ہے۔ انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر میں نماز کی کیا اہمیت ہے‘ اس ضمن میں سورۃ العنکبوت کی زیر مطالعہ آیت میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ﴾ ’’یقیناً نماز بے حیائی کے کاموں سے اور منکر (یعنی بدی کے کاموں) سے روکنے والی شے ہے‘‘۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ نماز ہو‘ محض ایک رسم نہ ہو ؎

رہ گئی رسم اذاں‘ روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا‘ تلقینِ غزالی نہ رہی!

اگر وہ نماز شعور کے ساتھ ہے‘ اپنی تمام باطنی کیفیات کے ساتھ ہے‘ اپنی تمام ظاہری قیود اور آداب کے ساتھ ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا: ﴿تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ﴾۔ گویا انسان کی ذاتی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے بھی نماز سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر‘ جسے علامہ اقبال نے ’’تعمیر خودی‘‘ سے تعبیر کیا ہے‘ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو پروگرام دیا ہے اس کی اساسات میں نماز کو حصار اور فصیل کی حیثیت حاصل ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے لفظ اساسات کو سمجھئے۔ آپ نے ایک مکان بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ اس کی بنیادیں بھرتے ہیں اور یہ بنیاد ہی معیّن کرتی ہے کہ مکان کا نقشہ کیا ہوگا اور مکان کتنا مضبوط ہوگا۔ جس طرز کی آپ نے بنیاد رکھی ہے آپ عمارت بھی اُسی طرز کی بنا سکتے ہیں‘ اُس سے مختلف نہیں۔ گویا نقشہ تو اب وہی رہے گا جو بنیاد میں پڑ گیا اور عمارت کی مضبوطی کے لیے بھی اَولین اور اہم ترین شے بنیاد کی مضبوطی ہے۔ چنانچہ تعمیر سیرت کے لیے جو پروگرام قرآن نے دیا ہے اور اس کی اساس میں جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے تجویز فرمائی ہیں‘ ان میں گویا حصار اور فصیل کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔

سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے قرآن مجید کے دو مقامات ہمارے منتخب نصاب میں موجود ہیں اور یہاں میں ان دونوں اسباق کی طرف صرف اشارہ کر رہا ہوں۔ پہلا مقام ہے سورۃ المؤمنون کا پہلا رکوع: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲﴾ ’’کامیاب ہو گئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع و خضوع اختیار کرنے والے ہیں‘‘ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کا احساس رکھتے ہیں۔ اس کے بعد بہت سے اوصاف بیان کر کے اَخیر میں پھر فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹﴾ ’’اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی (پوری طرح) حفاظت کرتے ہیں‘‘۔ پہلے نماز کے باطن کی طرف اشارہ ہے کہ باطنی کیفیت خشوع و خضوع والی ہو اور پھر نماز کے نظام کی طرف اشارہ ہے۔ بہرحال معلوم ہوا کہ انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے پورے پروگرام کا اول و آخر نماز ہے۔

یہ مضمون اور زیادہ نکھر کر آیا ہے سورۃ المعارج میں جہاں انسان کو ایک کچی شے سے تعبیر کیا گیا ہے جسے پکانا مقصود ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝۱۹﴾ کہ انسان اپنی خلقت اور سرشت کے اعتبار سے تھڑدلا‘ کمزور اور کم ہمت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے: ﴿اِذَا

مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا ۝۲۱﴾ کہ جب کوئی تکلیف آتی ہے تو چیختا چلاتا ہے‘ نالہ و شیون اور فریاد کرتا ہے۔ یعنی اس میں تحمل نہیں ہے‘ برداشت نہیں ہے‘ جھیلنے کی صلاحیت اور استعداد نہیں ہے۔ اور اگر کچھ مال و دولت مل گیا تو پھر بڑا روک روک کر رکھتا ہے‘ بخیل بن جاتا ہے‘ تاکہ کسی اور کو اس مال سے کوئی فائدہ نہ پہنچ جائے۔ یہ ہے انسان کا تھڑدلا پن اور یہ اس کے سرشت‘ اس کی خِلقت اور اس کی طبیعت کے اعتبار سے اس میں خامی ہے۔ اس خامی کو پختہ کرنے کا نام تعمیرِ سیرت ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

اس خام ہی کو پختہ کرنا مقصود ہے‘ اس زرِ خام کو ہی اب سونا بنانا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی تعمیرِ سیرت یا تعمیرِ خودی یا انسانی شخصیت کی پختگی (maturity) اور استحکام کے پروگرام میں سب سے پہلے نماز کا ذکر ہے۔ گویا قرآن مجید کی رو سے اس تھڑدلے پن سے نجات پانے والے یہ لوگ ہیں: ﴿اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ۝۲۲ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳﴾ ’’سوائے نمازیوں کے‘ جو اپنی نمازوں پر مداومت کرتے ہیں‘‘---- یہاں ایک ضمنی بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ عربی میں مُصَلِّیْ کا معنی ہے: نماز پڑھنے والا۔ یہ ہمارے پنجاب کے دیہات کا ’’مُصلّی‘‘ نہیں ہے‘ جسے نہایت درجہ استحقار سے دیکھا جاتا ہے۔ مُصَلِّیْ تو بہت بڑی صفت ہے —— قرآن مجید کی رو سے اس تھڑدلے پن سے نجات صرف وہ لوگ پا سکتے ہیں جو اپنی نمازوں پر مداومت اور پابندی کرتے ہیں۔ یہاں سے بات چلی تو پھر اختتام بھی اسی پر ہوا: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۳۴ اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝۳۵﴾ ’’اور وہ لوگ جو اپنی نماز کی محافظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اعزاز و اکرام ہوگا‘‘ —— تو پہلی بات نوٹ کر لیجیے کہ تعمیرِ سیرت‘ تعمیرِ شخصیت‘ تعمیرِ خودی‘ انسان کی شخصیت کا پختہ ہونا‘ اس مسِ خام کا سونا بننا‘ اس کا سارا دارومدار جس پروگرام پر ہے اس کا اول و آخر نماز ہے۔ گویا اس پورے پروگرام کو اگر ہم ایک شہر سے تعبیر دیں تو شہر کی فصیل نماز ہے۔

اقامتِ صلاۃ اور نظامِ اوقاتِ صلاۃ

اب آیئے دوسری بات کی طرف کہ قرآن مجید میں نماز ادا کرنے یا نماز پڑھنے کا ذکر کہیں نہیں ہے‘ بلکہ اقامتِ صلاۃ یعنی نماز قائم کرنے کا ذکر ہے۔ گویا نماز صرف ایک انفرادی شے کی حیثیت سے فرض نہیں کی گئی‘ بلکہ اس کا ایک اجتماعی نظام بنایا گیا ہے اور اسی لیے قرآن میں ہر جگہ نماز کو قائم کرنے کا حکم ہے۔ اس قائم کرنے کے دو پہلو ہو جائیں گے۔ ایک خالص انفرادی ہے کہ جو فرد نماز کے لیے کھڑا ہے اس میں خشوع و خضوع ہو‘ حضوری کی کیفیت ہو‘ استحضارِ قلب ہو۔ دوسرا پہلو اجتماعیت اور نظامِ صلاۃ سے متعلق ہے‘ جس کے لیے محافظت اور مداومت کا حکم سورۃ المؤمنون میں بھی آیا اور سورۃ المعارج میں بھی۔ یہ جو نظامِ صلاۃ ہے درحقیقت اسی پر ہمارے دین کا پورا نظام کھڑا ہے‘ بلکہ یوں کہیے کہ اسی کی ایک پروجیکشن‘ اسی کی ایک توسیع‘ اسی کی ایک ایکسٹینشن ہے۔ یہ مرکزی اہمیت ہے اقامتِ صلاۃ کو پورے دین کے نظام میں۔ پھر یہ کہ اجتماعی نظام میں بھی اصل شے تو افراد ہی ہیں ؎

اَفراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

اور اس ضمن میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ افراد کی تعمیرِ سیرت کے لیے اصل اساس نماز ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات جمع کر لیجیے کہ افراد کے دن بھر کے معمولات اور نظام الاوقات کو یہ نظامِ صلاۃ جکڑ لیتا ہے‘ مجال ہے کہ اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ نمازِ فجر کے لیے بیدار ہونے والا آدمی سارا دن کس قدر چاق و چوبند رہے گا۔ یہ نہیں کہ صبح کو جب تک چاہا سوتے رہے۔ یہ تو مغربی اقوام کا شیوہ اور جدید تہذیب کا خاصہ ہے کہ ان کی رات نصف شب کے بعد شروع ہوتی ہے اور طلوعِ آفتاب کس شے کا نام ہے‘ وہ انہیں معلوم ہی نہیں۔ لیکن نظامِ صلاۃ کی پابندی کے لیے طلوعِ آفتاب سے کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آپ اُٹھیں گے تو فجر کی نماز باجماعت ادا کر سکیں گے۔ گویا نظامِ صلاۃ نے آپ کو طلوعِ فجر کے ساتھ جکڑ دیا اور اس سے آپ دن بھر active رہیں گے۔ پھر ظہر‘ عصر‘ مغرب اور عشاء اپنے اپنے وقت میں ادا

کریں گے۔

یہاں یہ بھی دیکھئے کہ نمازِ فجر اور ظہر میں تقریباً سات آٹھ گھنٹے کا وقفہ ہے۔ اس کی حکمت اللہ نے یہ رکھی ہے کہ انسان کی معاشی ضروریات بھی ہیں‘ اسے کسی دفتر جانا ہے‘ اُسے دوکان پر جانا ہے‘ اس کی کوئی اور ذمہ داری ہے جو اس نے ادا کرنی ہے‘ اس کے لیے ایک وقفہ رکھ دیا ہے جو تقریباً سات آٹھ گھنٹے کے مساوی بن جاتا ہے جس میں کوئی نماز فرض نہیں کی۔ یہ تو اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے‘ اس لیے اس کے اندر ساری حکمتیں ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ انسان کی کیا ضرورتیں ہیں‘ اس کے کیا حوائج ہیں‘ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے فجر سے ظہر تک کوئی فرض نماز نہیں ہے۔ اگرچہ درمیان میں نفل نمازیں آ جاتی ہیں‘ مثلاً طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد ’’اشراق‘‘ اور پھر ’’صلاۃ الضحیٰ‘‘ جسے عام مفہوم میں چاشت کی نماز کہا جاتا ہے۔ اس کے وقت کے بارے میں یوں سمجھئے کہ جیسے نصف النہار کے بعد ظہر ہے‘ اسی طرح اس سے کچھ پہلے یہ صلاۃ الضحیٰ ہے۔ اگر کسی شخص کے لیے ممکن ہو تو وہ ضرور ادا کرے‘ اس کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ لیکن فجر سے ظہر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی فرض نماز نہیں رکھی‘ البتہ اس کے بعد تو نماز ہی نماز ہے۔ گویا مسلسل آنا جانا ہے۔ ذرا سا بھی آپ غافل ہو جائیں گے تو نماز باجماعت نکل جائے گی۔ اب آپ وہ نماز انفرادی طور پر ادا کریں گے یا آپ قضا کر کے بعد میں پڑھ لیں گے‘ لیکن ان دونوں صورتوں میں نماز باجماعت اور اقامتِ نماز کا تصور فوت ہو گیا اور اب وہ فضیلت کسی طور سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا یوں سمجھئے کہ فرد کی زندگی اور اس کے نظام الاوقات کو جکڑ لینے والی شے اور اس میں بیداری‘ ہوشیاری اور چوکسی کو برقرار رکھنے والی سب سے بڑی شے نماز ہے۔

اجتماعیت میں نماز کی اہمیت

اب اس سے آگے آیئے۔ اجتماعیت کی پہلی اینٹ یہ ہے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں ہے‘ اس کی علامت معیّن ہونی چاہیے۔ اس حوالے سے جو بڑے طویل مباحث ہیں‘ ان کو اس وقت مَیں نہیں چھیڑ رہا‘ بلکہ اسلامی معاشرے میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کی لازمی علامت کی بات کر رہا ہوں (لازمی شرط نہیں!) واقعہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں

کسی شخص کے مسلمان ہونے کی لازمی علامت اقامتِ صلاۃ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ نبویؐ میں کٹر منافقین کو بھی باجماعت نماز پڑھنی پڑھتی تھی‘ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا چاہتے تھے۔ اسی کو حضور ﷺ نے ایک حدیث میں یوں فرمایا: ((بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيْمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(سنن الترمذی،کتاب الإیمان، باب ما جاء فی ترک الصلاۃ) ’’کفر اور ایمان کے درمیان فرق کرنے والی شے نماز ہے‘‘۔ گویا اجتماعیت کے لیے بھی جو اساس بن رہی ہے اس کے اندر اہم ترین شے نماز ہے۔

نوٹ کر لیجیے کہ میں یہاں قانونی زبان میں بات نہیں کر رہا اور نماز کو مسلمان ہونے کی شرطِ لازم نہیں کہہ رہا۔ چنانچہ ایک شخص اگر نماز نہیں پڑھتا ہے تو اُس کو ہم کافر نہیں کہیں گے۔ البتہ اسلامی نظام ہوگا تو اسے سزا دی جائے گی۔ بعض فقہاء کے نزدیک تو تارکِ صلاۃ کا قتل بھی جائز ہے‘ بلکہ قتل کر دینا واجب ہے‘ جبکہ امام ابوحنیفہؒ کے ہاں سب سے زیادہ نرمی ہے اور وہ بھی یہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے والے کو قید کر دو اور اُس وقت تک رہا نہ کرو جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے اور باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا عہد نہ کرے۔ بے نمازی کی تعزیر میں تو فقہاء کا اختلاف ہے‘ البتہ منکرِ صلاۃ سب کے نزدیک کافر ہے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ افراد کی تعمیرِ سیرت کا اساسی پتھر (foundation stone) نماز ہے۔ پھر افراد کے نظام الاوقات کو جکڑنے والی‘ انہیں بیدار اور چوکس رکھنے والی شے اقامتِ صلاۃ اور نظامِ اوقاتِ صلاۃ ہے۔ دوسری بات یہ کہ افراد جب معاشرے کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس کی بھی سب سے بڑی علامت‘ سب سے بڑا شعار نماز ہے۔

مساواتِ انسانی کا عظیم مظہر: نماز

اب تیسری چیز دیکھئے۔ اسلام اور اسلامی معاشرے کا ایک بہت بڑا امتیازی وصف ’’مساوات‘‘ ہے جس کی عظمت کا اقرار کفار نے بھی کیا ہے‘ دشمنوں نے بھی کیا ہے۔ ایچ جی ویلز جیسا شخص‘ جسے حضور ﷺ سے بڑی ہی عداوت تھی‘ بھی یہ تسلیم کیے بغیر نہ رہ سکا کہ:

’’اگرچہ انسانی حریت‘ مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے

گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری (حضرت مسیح علیہ السلام کی جائے ولادت ناصرہ گاؤں تھا‘ اس لیے آپؑ مسیح ناصری کہلاتے ہیں) کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں‘ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔‘‘

اس مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا مظاہرہ اقامتِ صلاۃ کے موقع پر ہوتا ہے۔ گورنر آئے یا صدرِ مملکت اُسے اسی صف میں شامل ہونا ہوگا اور اس کا چپڑاسی بھی کندھے سے کندھا ملا کر اس کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ یہ تو ہمارے ہاں غلط حرکتیں ہوتی ہیں کہ کچھ جگہ مخصوص کر لی اور وہاں گورنر صاحب کھڑے ہو گئے اور دائیں بائیں بڑے بڑے افسر کھڑے ہو گئے۔ اسلامی نظام میں اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسجد میں جگہ محفوظ (reserve) کرنا آداب کے خلاف ہے۔ نماز میں صف بندی کے حوالے سے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز!

کوئی پشتینی رئیس ہو یا کوئی پشتینی عالم یا کوئی بہت بڑا صوفی ہو اور کوئی چمار جس نے ابھی کلمہ پڑھا ہو‘ یہ دونوں ایک صف کے اندر کندھے سے کندھا ملا کر برابر کھڑے ہوں گے۔ ان میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہوگا۔

بہرحال مساوات ہمارا سب سے اعلیٰ وصف ہے اور دنیا اگر تاثر قبول کرے گی تو ان چیزوں سے کرے گی جو ان کے ہاں نہیں ہیں۔ ان کے ہاں رنگ اور نسل کی بنیاد پر اونچ نیچ ہے‘ فرق و تفاوت ہے اور اس فرق کو ختم کرنے کے لیے انہیں کتنے جہاد کرنے پڑے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے امریکہ کو یہ فرق ختم کرنے کے لیے کتنی بڑی سول وار لڑنی پڑی ہے۔ اس کے باوجود وہ فرق و تفاوت آج بھی قائم ہے‘ گورے اور کالے کے درمیان کوئی محبت نہیں پیدا ہو سکی اور دلوں کے اندر بُعد ابھی بھی باقی ہے۔ جبکہ یہاں مساوات کا دور دورہ ہے اور اس کا سب سے بڑا مظہر نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِسْتَوُوْا وَلَا

تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ))(صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب تسویۃ الصفوف واقامتھا...) ''برابر ہو جاؤ اور بے ترتیب نہ ہو' ورنہ تمہارے دلوں میں بھی نااتفاقی آ جائے گی''۔ گویا یہ صف بندی کے آداب میں سے ہے کہ کندھے سے کندھا ملا ہونا چاہیے اور جڑ کر کھڑے ہونا چاہیے' اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے دل جڑ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فصل درحقیقت اندر کا فصل ہے اور اس کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑا ہوا جائے۔ چنانچہ مساوات جو اسلامی معاشرے کی ایک بہت نمایاں اور امتیازی خصوصیت ہے' اس کا سب سے بڑا مظہر اور اس کا سب سے بڑا مظاہرہ اقامتِ صلاۃ کے ذریعے سے ہے۔ پھر اسی کے ذریعے سے معاشرے کی تنظیم ہے۔

لوگوں کی تنظیم کا ذریعہ: نماز

واقعہ یہ ہے کہ ہم غور نہیں کرتے' سوچتے نہیں' وہ بات دوسری ہے' لیکن ذرا غور کریں کہ اجتماعی نظام میں نماز کی کتنی مرکزی اور محوری (pivotal) پوزیشن ہے۔ اس ضمن میں چوتھی بات عرض کر رہا ہوں کہ معاشرہ کی تنظیم (organization of the society) کا ذریعہ بھی نماز ہے۔ ہر محلے کے لوگ دن میں پانچ مرتبہ مسجد میں نماز کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص دور جا کر کام کرتا ہے' تب بھی وہ ظہر کو چھوڑ کر باقی چار نمازیں تو محلے کی مسجد میں ادا کرے گا۔ چلیے عصر میں بھی کوئی نہیں پہنچ پایا تو پھر بھی فجر' مغرب اور عشاء میں تو آئے گا اور ان میں آپ کو معلوم ہے کہ قراءت جہری ہے یعنی بلند آواز سے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ان نمازوں کو خصوصی فضیلت حاصل ہے۔ اس میں اب تنظیم ہو رہی ہے کہ کون آیا' کون نہیں آیا اور جو نہیں آیا تو اس کے نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟ کوئی بیمار ہو گیا ہے یا کسی کو کوئی اور کوئی عذر لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی ایک تشویش' اس کا ایک خیال' اس کا ایک احساس پیدا ہو گا۔ اور اگر کوئی مسلسل غیر حاضر ہے تو اس کے بارے میں زیادہ تشویش ہو گی کہ یہ دین سے بہت دور جا رہا ہے یا منافقین کی فہرست کے اندر کہیں اس کا نام درج ہونے لگا ہے۔ اس سارے معاملے کا ذریعہ محلے کی مسجد کی نماز ہے۔

اب اس سے ذرا آگے چلتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار جامع مسجد کے ساتھ ایک بڑی

آبادی کے لوگوں کی تنظیم ہو گئی۔ اس وقت بدقسمتی سے ہمیں یہ سہولت حاصل نہیں ہے' اس لیے کہ اب تو ہر مسجد جامع مسجد بن گئی ہے' حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے اندر جمعہ کی نماز نہیں ہونی چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پورے شہر کی ایک جامع مسجد تو اب نہیں ہو سکتی' پچاس ساٹھ لاکھ آدمیوں کے لیے ایک جامع مسجد تو نہیں ہو سکتی' لیکن یوں سمجھئے کہ آج کل ہمارے ہاں یہ جو محلے' کالونیاں اور ٹاؤنز بنے ہوئے ہیں' ان میں تو ایک جمعہ ہونا چاہیے۔ جیسے ماڈل ٹاؤن میں تو ایک جمعہ ہو سکتا ہے (جیسے یہاں عید کی نماز ایک ہوتی ہے۔) یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ناممکن ہو۔ یا کم از کم ایک ٹاؤن کے ہر بلاک میں تو ایک جمعہ ہو۔ یہ تو نہیں کہ ایک ایک بلاک کے اندر تین تین' چار چار مسجدیں ہیں اور ہر جگہ جمعہ ہو رہا ہے۔ بہرحال جمعہ کے نظام سے ایک بڑی آبادی جمع ہوتی ہے اور پھر عیدین میں اس سے بڑا ایک اجتماع ہے۔ اور حج کے موقع پر عالمی سطح پر پوری مسلم برادری کا ایک اجتماع ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اضافی فائدہ ہے اس اقامتِ صلاۃ کا۔ اس میں پورا معاشرہ چاق و چوبند ہے اور ہر فرد کے بارے میں احساس پیدا ہو رہا ہے۔

نماز سے منسلک دو اہم چیزیں

اسلام نے نماز کے ساتھ دو چیزیں اور وابستہ کر دی ہیں۔ نظامِ عدالت کی ایک بڑی اہم بات نماز کے ساتھ منسلک ہے۔ اسلام کے عدالتی نظام میں تزکیۃ الشہود کا قاعدہ رائج ہے کہ ہر ایرے غیرے' نتھو خیرے کی گواہی قبول نہیں ہو سکتی۔ گواہ کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی اس کی آبادی کے رہنے والے کچھ لوگ تصدیق کریں گے کہ ہاں یہ شخص نماز میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے کردار میں کوئی ایسی خامی نہیں ہے کہ جس کی بنا پر اس کی گواہی قابلِ اعتماد نہ ہو۔ چنانچہ تزکیۃ الشہود کے اندر اہم ترین اور پہلی بات نماز کی پابندی ہے۔ گویا اقامتِ صلاۃ کے ساتھ آپ کا نظامِ عدل بھی وابستہ ہو گیا۔

اسی سے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلام کے نظامِ اراضی کو مستنبط کیا ہے کہ اسلام میں زمینداری کا کیا نظام ہے اور اس کے کیا احکام ہیں۔ پہلی بات یہ کہ مسجد وقف ہے یعنی مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ

مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا))(صحیح البخاری‘کتاب الصلاۃ) ’’میرے لیے پوری زمین مسجد اور پاکی (تیمم) کا ذریعہ بنادی گئی ہے‘‘۔اس اعتبار سے گویا پوری کی پوری زمین اللہ کے لیے وقف ہے اور یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ یہ ذرا ٹیڑھا مسئلہ ہے۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا‘صرف اشارہ کررہا ہوں۔اس سے آپ کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہوں گے اور پھر آپ سوچیں گے‘غور کریں گے۔ پہلے کوئی بات معلوم ہوتو پھر اس سے سوالات اُبھرتے ہیں اور سوالات کے حل کے لیے جب انسان کوشاں ہوتا ہے تو علم آگے بڑھتا ہے۔اسی طریقے سے علم کی پیش قدمی ہوتی ہے۔

اسی سے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا گیا ہے کہ جیسے نماز کی جگہ پر آکر جو شخص بیٹھ گیا اسے کوئی وہاں سے اٹھا نہیں سکتا —— یہ نہیں کہ بڑا چودھری آ گیا ہے‘تم یہاں سے ہٹ جاؤ‘یا فلاں صاحب آ گئے ہیں‘پہلی صف خالی کردو۔قطعاً نہیں! جو پہلے آیا اسی کا حق ہے —— اسی بنیاد پر یہ مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے کہ بنجر اور بے آباد زمین کو جو شخص بھی آباد کرلے وہ اُسی کے پاس رہے گی‘آپ اس کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتے۔ میں لفظ ملکیت استعمال نہیں کررہا‘ لیکن اس کے استعمال کا حق اس کے پاس ہے اور آپ اس سے اس کا وہ حق چھین نہیں سکتے۔

اسی سے تیسری بات یہ مستنبط ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص تین سال تک اپنی زمین کو بلا کاشت چھوڑ دیتا ہے تو اس کا حق ساقط ہوجاتا ہے۔اب جو شخص اسے پھر قابلِ کاشت بنا کر کاشت کرے گا تو وہ اس کے پاس رہے گی۔اسی طرح جو شخص مسجد میں اپنی جگہ چھوڑ کر چلا جائے وہ واپس آ کر جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جائے۔ ہمارے ہاں جو نشانیاں رکھ دی جاتی ہیں‘اس کو آپ کسی حد تک قابلِ قبول کہہ سکتے ہیں‘لیکن مستقل اپنی جگہ reserve کروالینا صحیح نہیں ہے۔آپ جارہے ہیں تو پھر جو جگہ آپ کو ملے وہاں آ کے بیٹھیں۔

اقامتِ صلاۃ اور نظامِ حکومت کا باہمی تعلق

آخری بات کہہ رہا ہوں کہ اسلام کے پورے نظامِ حکومت کو نماز اور اقامتِ صلاۃ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔علامہ اقبال نے دین اور سیاست کی وحدت کی بات کی ہے ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دین اور سیاست کی وحدت یا دین اور ریاست کی وحدت‘ان کا انضمام‘ان کا جڑ جانا‘ان کا پیوست ہوجانا اس حوالے سے ہے کہ ریاست کا صدر‘وزیراعظم‘خلیفہ یا صوبے کا گورنر ہی اس شہر کی جامع مسجد کا خطیب ہوگا۔گویا خطبہ جمعہ کو نظامِ حکومت سے وابستہ کیا گیا ہے۔آج ہمارا نظام چونکہ اسلامی نظام نہیں ہے اس لیے سارا معاملہ درہم برہم ہے‘ورنہ کسی مسجد میں کوئی شخص اپنی آزاد مرضی سے خطبہ نہیں دے سکتا۔خطیب حکومت کی طرف سے معیّن اور مقرر ہوگا‘اس لیے کہ درحقیقت جمعہ کی خطابت نظامِ حکومت کا جزو ہے۔

آپ محلوں میں مسجدیں بنالیں اور ان میں نماز ادا کریں تو کوئی حرج نہیں۔بس یہ ہے کہ وہاں خطبہ نہیں ہوگا۔ جہاں خطبہ ہوگا وہاں حکومت کا معاملہ شروع ہوجائے گا اور وہاں کا انتظامی سربراہ خطبہ دے گا۔اگر وہ کوئی گرداوری کا حلقہ ہے تو گرداور یا قانون گو وہاں نماز پڑھائے گا۔اگر آپ پٹواری کے حلقے کو یونٹ قرار دے دیں تو پٹواری نماز پڑھائے گا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ اوپر چلتے جایئے۔تحصیل ہیڈکوارٹر ہے تو تحصیل دار نماز پڑھائے گا۔ ضلعی ہیڈکوارٹر ہے تو ڈپٹی کمشنر اور صوبائی دارالحکومت ہے تو گورنر نماز جمعہ کی امامت اور خطابت کرے گا اور اگر دارالسلطنت اور دارالخلافہ ہے تو خلیفہ وقت یا سربراہِ مملکت وہاں کا خطیب ہوگا۔وہ جمعہ کی نماز کی امامت بھی کرائے گا اور خطابت بھی۔

اس طریقے سے پورے اسلامی نظام کو اس نظامِ صلاۃ کے ساتھ وابستہ کردیا گیا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ نماز کا ایک باطنی اور انفرادی پہلو ہے جس پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہوگئی تھی اور انسان کے کردار‘تعمیرِ سیرت‘ روحانی ترقی‘ فکر صحیح کے ارتقاء کے لیے نماز کی اہمیت بیان کردی گئی تھی۔ پھر یہ کہ اس نظام کے جملہ پہلو جو ممکن ہوسکتے ہیں‘میں نے ان سب کو آپ کے سامنے ایک ایک کرکے بیان کردیا ہے۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ درحقیقت اقامتِ صلاۃ اور نظامِ صلاۃ کو پورے اجتماعی نظام میں نیوکلیئس اور محور کی حیثیت حاصل ہے۔گویا نماز وہ لنگر ہے جس کے ساتھ اسلام کے نظامِ اجتماعی کا پورا جہاز منسلک ہے۔

میں اپنی گفتگو علامہ اقبال کے ایک شعر پر ختم کر رہا ہوں۔ ہمارا جو اس وقت کا نظام ہے‘ ہماری نمازیں اور خطیب ہیں‘ اس پر اگرچہ بڑے تلخ انداز میں‘ مگر صحیح ترین تعبیر کے ساتھ علامہ اقبال نے پھبتی چست کی تھی ؎

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

ہم نے مسجد کی امامت کو اس طرح degrade کیا ہے کہ اسے ایک علیحدہ نظام بنا دیا ہے جس کا پورے نظامِ زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ امامت اپنی جگہ پر ایک پروفیشن بن گیا ہے‘ حالانکہ امامت کی عظمت کے بارے میں تو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ اپنے زمانے میں خود امام تھے‘ پھر حضرات ابوبکرؓ‘ عمرؓ‘ عثمانؓ‘ علیؓ (رضی اللہ عنہم) مرکزی جگہ پر امام تھے۔ گورنرز اپنے صوبوں میں امام تھے۔ اس طریقے سے دین‘ دنیا اور سیاست کو آپس میں جوڑنے والی شے نماز کا نظام ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اقامتِ صلاۃ کی اصل حقیقت پر متنبہ کیے رکھے اور ان دونوں خطابات کے ذریعے سے جو باتیں ہمارے سامنے آئی ہیں اور ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے‘ اللہ تعالیٰ اس پر فوری طور پر صحیح معنوں میں ہمیں عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین! ۞۞۞

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمد

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الجَاثِیۃ

سورۃ الجاثیہ اور اس کے بعد والی سورت یعنی سورۃ الاحقاف کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ ان دونوں سورتوں کے درمیان ایک نسبت یہ بھی ہے کہ ان کے آغاز کی دو آیات مشترک ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِی
السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾ وَ فِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَ مَا
یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ
النَّہَارِ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡیَا بِہِ
الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ
یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۵﴾ تِلۡکَ اٰیٰتُ اللّٰہِ نَتۡلُوۡہَا عَلَیۡکَ بِالۡحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ
حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ وَیۡلٌ لِّکُلِّ اَفَّاکٍ
اَثِیۡمٍ ﴿۷﴾ یَّسۡمَعُ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُتۡلٰی عَلَیۡہِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسۡتَکۡبِرًا کَاَنۡ لَّمۡ
یَسۡمَعۡہَا ۚ فَبَشِّرۡہُ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۸﴾ وَ اِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰیٰتِنَا شَیۡئَۨا
اتَّخَذَہَا ہُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۹﴾ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ
جَہَنَّمُ ۚ وَلَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ مَّا کَسَبُوۡا شَیۡئًا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ

دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۰﴾ ہٰذَا ہُدًی ۚ وَ
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَہُمۡ عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰہُ
الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ وَلِتَبۡتَغُوۡا
مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ
یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

آیت ۱ ﴿حٰمٓ ﴿۱﴾﴾ ’’ح‘م۔‘‘

آیت ۲ ﴿تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾﴾ ’’اس کتاب کا اُتارا جانا ہے اُس اللہ کی طرف سے جو زبردست‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

آیت ۳ ﴿اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾﴾ ’’یقیناً آسمانوں اور زمین میں (بہت سی) نشانیاں ہیں ماننے والوں کے لیے۔‘‘

آیت ۴ ﴿وَفِیۡ خَلۡقِکُمۡ وَمَا یَبُثُّ مِنۡ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾﴾ ’’اور تمہاری تخلیق میں‘ اور جو اُس نے پھیلا دیے ہیں (زمین میں) جاندار اُن میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کریں۔‘‘

آیت ۵ ﴿وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ﴾ ’’اور رات اور دن کے اختلاف میں‘ اور اس میں جو اللہ آسمان سے رزق اُتارتا ہے‘‘

رزق سے مراد یہاں بارش کا پانی ہے جو زمین سے روزی کے نکلنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ بارش کے پانی کا نزول گویا انسانوں اور دوسرے جانداروں کے لیے رزق کا نزول ہے۔

﴿فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا﴾ ’’پھر زندہ کر دیتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد‘‘

وہ زمین جو بنجر اور بے آب و گیاہ پڑی تھی بارش کے برستے ہی ہریالی اور طرح طرح کے نباتات کے لباس میں ملبوس نظر آنے لگی۔

﴿وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۵﴾﴾ ’’اور ہواؤں کے چلنے میں‘

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔‘‘

یہاں پر سورۃ البقرۃ کی وہ آیت ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیں جسے میں نے ’’آیت الآیات‘‘ کا عنوان دیا تھا:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں‘ اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں‘ اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں‘ اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے‘ پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد‘ اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے‘ اور ہواؤں کی گردش میں‘ اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان‘ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔‘‘

گویا سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں جو نشانیاں بیان ہوئی ہیں ان میں سے اکثر کا ذکر زیر مطالعہ تین آیات میں آ گیا ہے۔

آیت ۶ ﴿تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ﴾ ’’یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم پڑھ کر سنا رہے ہیں آپ کو حق کے ساتھ۔‘‘

﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾﴾ ’’تو اب اللہ اور اُس کی آیات کے بعد اور کون سی بات ہے جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟‘‘

اگر یہ لوگ کائنات میں موجود آیاتِ آفاقی کا بچشم سر مشاہدہ کرنے اور قرآن کی آیات کو سننے کے بعد بھی ایمان نہیں لائے تو اور کس معجزے کو دیکھ کر ایمان لائیں گے؟ ایمان کی دولت تو صرف اسے ہی نصیب ہوتی ہے جو خود طالبِ ہدایت ہو۔ بلاشبہ قرآن ہر طالب ہدایت کے لیے ایک بہت بڑا معجزہ‘ سراج منیر اور منبع رشد و ہدایت ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہدایت کی طلب ہی نہ ہو تو وہ بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے گا۔

آیت ۷ ﴿وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ۙ﴾ ’’بربادی ہے ہر جھوٹ گھڑنے والے گنہگار

کے لیے۔‘‘

آیت ۸ ﴿یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰی عَلَیْهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا ۚ﴾ ’’وہ سنتا ہے اللہ کی وہ آیات جو اسے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں‘ پھر وہ اَڑ جاتا ہے ضد پر تکبّر کرتے ہوئے جیسے کہ اُس نے انہیں سنا ہی نہ ہو۔‘‘

﴿فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۸﴾﴾ ’’تو آپؐ اسے ایک دردناک عذاب کی بشارت دے دیجیے۔‘‘

یہ دراصل سردارانِ قریش کے رویے کا ذکر ہے۔ ان میں سے اکثر کا یہی حال تھا۔

آیت ۹ ﴿وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْـًٔا ۨ اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹﴾﴾ ’’اور جب ہماری آیات میں سے کوئی بات اس کے علم میں آتی ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے اہانت آمیز عذاب ہوگا۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ﴾ ’’ان کے پیچھے جہنم ہے۔‘‘

یعنی جہنم ان کی منتظر ہے —— وَرَاء کا لفظ ہر اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو آدمی کی نظر سے اوجھل ہو خواہ آگے ہو یا پیچھے ہو۔ لہٰذا ان الفاظ کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ’’ان کے آگے جہنم ہے‘‘ جس میں وہ گرنے والے ہیں۔

﴿وَلَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْـًٔا﴾ ’’اور جو کچھ انہوں نے کمایا ہے وہ ان کے ذرا بھی کام نہیں آ سکے گا‘‘

دُنیا میں انہوں نے جو کچھ کمایا ہے اور مال و دولت جمع کیا ہے‘ یہ سب کچھ انہیں جہنم سے نہ بچا سکے گا۔

﴿وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۰﴾﴾ ’’اور نہ وہ جن کو انہوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا رکھا ہے‘ اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہوگا۔‘‘

اللہ کے سوا انہوں نے جو جھوٹے معبود بنا رکھے ہیں اور ان کی سفارش اور شفاعت کا انہیں زعم بھی ہے‘ وہ بھی اس دن انہیں جہنم کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿هٰذَا هُدًی ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ

اَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ ’’یہ (قرآن) ہے ہدایت۔ اور جن لوگوں نے اپنے رب کی آیات کا کفر کیا ان کے لیے بہت ہی دردناک عذاب ہوگا۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ﴾ ’’اللہ ہی ہے جس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے سمندر کو تاکہ اس میں کشتیاں چلیں اُس کے حکم سے‘‘

﴿وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’تاکہ تم تلاش کرو اُس کا فضل اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔‘‘

اللہ کا فضل تلاش کرنے سے یہاں تجارت کے ذریعے روزی تلاش کرنا مراد ہے‘ جبکہ کشتیاں اور جہاز سمندروں اور دریاؤں میں سامانِ تجارت کی نقل و حمل کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

آیت ۱۳ ﴿وَسَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ﴾ ’’اور اُس نے مسخر کر دیا تمہارے لیے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ۔‘‘

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾﴾ ’’یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیں۔‘‘

اس مفہوم کی تمام آیاتِ قرآنی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ان میں بنی نوعِ انسان کے لیے دعوتِ تسخیر ہے کہ اللہ نے تو زمین و آسمان کی ہر ہر چیز کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے‘ اب یہ تمہاری ہمت پر منحصر ہے کہ تم اپنے علم اور ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر کس کس مقام اور کون کون سی چیز تک رسائی حاصل کرتے ہو۔ نیز ایسی آیات کے الفاظ میں نسل انسانی کے مستقبل کی ترقی کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مستقبل میں نہ معلوم اللہ تعالیٰ انسان کو ترقی کی کون کون سی منازل طے کرائے گا۔

آیات ۱۴ تا ۲۳

قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰہِ لِیَجۡزِیَ قَوۡمًۢا بِمَا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ﴿۱۴﴾ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفۡسِہٖ ۚ وَ مَنۡ اَسَآءَ فَعَلَیۡہَا ۟ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۵﴾ وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا

بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَ رَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾ۚ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۬ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ فَاتَّبِعۡہَا وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّہُمۡ لَنۡ یُّغۡنُوۡا عَنۡکَ مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بَعۡضُہُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ ۚ وَ اللّٰہُ وَلِیُّ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۱۹﴾ ہٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۲۰﴾ اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَہُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡیَاہُمۡ وَ مَمَاتُہُمۡ ؕ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ وَ لِتُجۡزٰی کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ وَ ہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰہَہٗ ہَوٰىہُ وَ اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمۡعِہٖ وَ قَلۡبِہٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً ؕ فَمَنۡ یَّہۡدِیۡہِ مِنۡۢ بَعۡدِ اللّٰہِ ؕ اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۲۳﴾

آیت ۱۴ ﴿قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یَغۡفِرُوۡا لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ اَیَّامَ اللّٰہِ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ وہ ذرا درگزر کریں ان لوگوں سے جو اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے‘‘

اس آیت کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی دَور کے تقریباً وسط میں نازل ہوئی ہے۔ گویا اُس وقت حضور ﷺ کی دعوت کو شروع ہوئے پانچ چھ سال ہی ہوئے تھے‘ یعنی ابھی اہلِ مکہ پر اتمامِ حجت نہیں ہوا تھا اور ابھی ان کے لیے مزید مہلت درکار تھی۔ چنانچہ اہلِ ایمان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ مشرکین کے مخالفانہ رویّے سے دلبرداشتہ نہ ہوں۔ یہ جہالت میں ڈوبے ہوئے گمراہ لوگ ہیں‘ انہیں ’’ایام اللہ‘‘ کے بارے میں کوئی کھٹکا اور اندیشہ ہے ہی نہیں۔ انہیں

ادراک ہی نہیں کہ جس عذاب نے ماضی کی بڑی بڑی اقوام کو نیست و نابود کر دیا تھا وہ ان پر بھی آ سکتا ہے۔ لہٰذا ابھی آپ لوگ ان سے درگزر کریں اور ان کے معاملے میں جلدی کرتے ہوئے یہ نہ سوچیں کہ نہ معلوم اللہ نے انہیں اس قدر ڈھیل کیوں دے رکھی ہے اور یہ کہ ان پر عذابِ موعود آ کیوں نہیں جاتا؟ اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ابھی مزید مہلت دینا چاہتا ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ قَوْمًا ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ⑭﴾ ''تاکہ اللہ بدلہ دے ایک قوم کو ان کی اپنی کمائی کے مطابق۔''

آیت ۱۵ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَاۗءَ فَعَلَيْهَا ۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ⑮﴾ ''جس کسی نے اچھا کام کیا تو اُس نے اپنے ہی (بھلے کے) لیے کیا' اور جس کسی نے برا کام کیا تو اس کا وبال بھی اُسی پر ہو گا' پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

آیت ۱۶ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو عطا کی کتاب' حکومت اور نبوت''

﴿وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ⑯﴾ ''اور ہم نے انہیں عطا کیں بہت سی پاکیزہ چیزیں' اور انہیں ہم نے تمام جہان کی قوموں پر فضیلت دی۔''

ان لوگوں کا نسبی تعلق اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے' لیکن جس قوم کا نام بنی اسرائیل ہے وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب ''اسرائیل'' (اللہ کا بندہ) تھا اور آپؑ کے بارہ بیٹوں کی اولاد سے بارہ قبیلے وجود میں آئے جو بنی اسرائیل کہلائے۔ قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کو فضیلت سے نوازے جانے کا ذکر تکرار سے آیا ہے۔ اس فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں نبوت کا وہ سلسلہ جو دو پیغمبروں (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام) سے شروع ہوا' چودہ سو برس تک بغیر کسی وقفے اور انقطاع کے جاری رہا۔ اس دوران ان کے ہاں پے در پے نبی آئے اور نبوت کی کڑی کے ساتھ کڑی یوں ملتی گئی کہ ایک مسلسل زنجیر بن گئی۔ پھر جس طرح اس زنجیر کا آغاز دو پیغمبروں سے ہوا تھا اسی طرح اس کا اختتام بھی دو پیغمبروں یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ہوا۔ بہرحال جتنے انبیاء بنی اسرائیل کی طرف آئے' دنیا میں کسی اور قوم کی طرف اتنے انبیاء نہیں آئے۔ اقوامِ عالم پر بنی اسرائیل کی یہ فضیلت آج بھی قائم ہے۔

بنی اسرائیل کے حوالے سے ہمارے لیے اصل سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ جب دین کی طرف پیٹھ پھیر کر' دنیا میں منہمک ہو گئے' عیاشیوں میں پڑ گئے اور آخرت کو بھول گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضیلت کی حامل اس قوم پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۤ﴾ اور اس فیصلے کا اعلان قرآن میں دو مرتبہ (البقرۃ:۶۱ اور آلِ عمران:۱۱۲) کیا گیا۔ چنانچہ تاریخ میں بنی اسرائیل آج ہمارے لیے عبرت کا سامان ہے۔ ہم پر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا خصوصی فضل اور احسان فرمایا کہ ہمیں اس نے اپنے آخری رسول ﷺ کی اُمت بنایا اور اپنی آخری کتاب سے نوازا۔ مگر ہم نے بھی جب دین کی طرف سے پیٹھ پھیر لی اور آخرت کو بھول کر دنیا ہی کو اپنا اوڑھنا' بچھونا بنا لیا تو ہمارے حصے میں بھی ویسی ہی ذلت و مسکنت آئی۔ چنانچہ آج دنیا میں ڈیڑھ سو کروڑ مسلمان ہیں مگر اقوامِ عالم کے درمیان ان کی حیثیت یہ ہے کہ ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟'' آج بین الاقوامی معاملات کے بارے میں کسی بھی فورم پر مسلمان ممالک کی رائے پوچھنے کی زحمت تک نہیں کی جاتی۔ بلکہ اب تو مسلمانوں کے اپنے معاملات کی باگ ڈور بھی غیروں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے میری انگریزی تقریر Turmoil in Muslim Ummah سے استفادہ کیا جا سکتا ہے' جبکہ اُردو میں تو اس موضوع پر میری بہت سی تقاریر دستیاب ہیں۔

آیت ۱۷ ﴿وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ﴾ ''اور ہم نے انہیں عطا کیں دین کے معاملہ میں واضح ہدایات۔''

یہاں ''امر'' سے مراد دین و شریعت ہے۔ یعنی ان کے انبیاء کو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام ضروری ہدایات مسلسل ملتی رہیں۔ اس کے علاوہ انہیں تورات' زبور اور انجیل جیسی کتابیں بھی عطا کی گئیں۔

﴿فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ﴾ ''اور انہوں نے نہیں اختلاف کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔''

کتاب اللہ کی واضح تعلیمات ان لوگوں تک پہنچ چکی تھیں۔ اس کے باوجود ضد بازی کی بنیاد پر ان کے اندر شدید اختلافات پیدا ہو گئے اور انہی اختلافات کی وجہ سے یہ قوم مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ پہلے یہودی اور نصاریٰ الگ الگ ہوئے اور پھر ان دونوں گروہوں کے

اندر باہمی ضِدّم ضِدا کے باعث مزید کئی کئی فرقے بن گئے۔ دراصل کسی بھی قوم کی صفوں میں اختلاف کی بنیادی وجہ غلبہ حاصل کرنے کی وہ خواہش (urge to dominate) ہوتی ہے جو اس کے ہر دھڑے میں پائی جاتی ہے۔ ان اختلافات سے تفرقہ بازی جنم لیتی ہے جس کے باعث بالآخر اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۷﴾ ''یقیناً آپؐ کا رب فیصلہ کر دے گا ان کے مابین قیامت کے دن ان تمام باتوں کا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔''

آیت ۱۸ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا﴾ ''پھر (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو قائم کر دیا دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر، تو آپ اسی کی پیروی کریں''

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں ﷺ تک تمام انبیاء رسل علیہم السلام اسی دین کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے۔ سورۃ الشوریٰ میں اس نکتے کی وضاحت ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى...﴾ (آیت ۱۳) ''(اے مسلمانو!) اُس نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اُس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیمؑ کو، موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو.....'' بہر حال ''امر اللہ'' یعنی اللہ کا دین تو شروع سے ایک ہی ہے۔ البتہ ہر زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے شریعتیں مختلف رہی ہیں، مثلاً شریعتِ موسویؑ کے بعض احکام شریعتِ محمدیؐ کے بعض احکام سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ آیت زیر مطالعہ کا مفہوم لفظ ''شَرِيْعَةٍ'' کے حوالے سے یہ ہے کہ اے محمد (ﷺ) بنی اسرائیل کے بعد ہم نے آپؐ کو اپنے دین کا آخری اور تکمیلی ایڈیشن شریعتِ محمدیؐ کے نام سے اس سند کے ساتھ عطا کیا ہے کہ: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کی تکمیل فرما دی ہے اور تم پر اتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے''۔ چنانچہ اب آپ اور آپ کے پیروکار اسی

شریعت کا اتباع کریں۔

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۸﴾ ''اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے جن کے پاس کوئی علم ہی نہیں ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کے کچھ بھی کام نہیں آ سکیں گے۔''

یہ مضمون قرآن میں متعدد بار آ چکا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں یوں فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ۝۷۳ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝۷۴ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۝۷۵﴾ ''اور یہ لوگ اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ آپؐ کو پھسلا دیں اس وحی سے جو ہم نے آپؐ کی طرف کی ہے تاکہ اس کے علاوہ آپؐ کوئی اور چیز گھڑ کر ہم سے منسوب کر دیں، اور اگر آپؐ ایسا کرتے تب تو یہ لوگ آپؐ کو اپنا دوست بنا لیتے۔ اور اگر ہم آپؐ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو عین ممکن تھا کہ آپؐ ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک ہی جاتے۔ (اگر ایسا ہو جاتا تو) تب ہم آپؐ کو دگنی سزا دیتے زندگی میں اور دگنی سزا دیتے موت پر، پھر نہ پاتے آپؐ اپنے لیے ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار۔''

﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹﴾ ''اور یقیناً یہ ظالم (مشرک) لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہیں، جبکہ اللہ مددگار ہے متقین کا۔''

آیت ۲۰ ﴿هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۲۰﴾ ''یہ ہیں آنکھیں کھولنے والی باتیں لوگوں کے لیے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لیے جو ان پر یقین کریں۔''

آیت ۲۱ ﴿اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''جو لوگ بری باتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں کیا انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے؟''

﴿سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۲۱﴾ ''کہ ان کی زندگی اور موت

ایک جیسی ہو جائے؟ بہت بُرا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں!‘‘

قیامت کے حساب اور آخرت کی زندگی کے بارے میں عقلی اور منطقی سطح پر یہ ایک مضبوط دلیل ہے۔ اگر دنیا کے نیکوکاروں کو کوئی اجر و انعام نہ ملے‘ مجرموں کو اپنے جرائم کی سزا نہ بھگتنی پڑے اور نیک و بد سب برابر ہو جائیں تو اس سے بڑا ظلم بھلا اور کیا ہوگا؟ دنیا میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جو حرام و حلال کی تمیز ختم کر کے اور جائز و ناجائز کی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو زندگی کے ہر معاملے میں ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ اپنے فائدے کے لیے کسی کا حق نہیں مارتے۔ وہ فاقوں سے رہنا برداشت کر لیتے ہیں مگر حرام نہیں کھاتے۔ اب فرض کریں کہ اگر دنیا کی زندگی ہی آخری زندگی ہو‘ نہ آخرت ہو اور نہ ہی مرنے کے بعد بے لاگ حساب و کتاب کا کوئی مرحلہ درپیش ہو‘ نہ نیک اور دیانت دار لوگوں کے لیے کوئی جزا ہو اور نہ برے لوگوں کے لیے کوئی سزا‘ تو ایسی صورت میں قاتلوں‘ لٹیروں اور ظالموں کے تو گویا وارے نیارے ہو گئے‘ جبکہ نیک‘ شریف اور دیانتدار قسم کے لوگ سراسر گھاٹے میں رہ گئے۔ اس لیے اگر قیامت قائم نہیں ہوتی‘ نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کی جزا نہیں ملتی اور بدکاروں کو ان کے کرتوتوں کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑتا تو یہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوگا۔ چنانچہ جو آخرت کو نہیں مانتا وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ہی منکر ہے۔

آیت ﴿وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ’’اور اللہ نے تو آسمان اور زمین کو حق (عدل) کے ساتھ پیدا کیا ہے تاکہ پورا پورا بدلہ دیا جائے ہر جان کو جو کچھ اُس نے کمایا ہو‘ اور ان پر کوئی ظلم نہ ہو۔‘‘

آیت ﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ ’’کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟‘‘

اس سے قبل یہ مضمون سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں بھی آ چکا ہے۔ یہاں اس کا اعادہ دراصل زیر مطالعہ آٹھ سورتوں (سورۃ الزمر تا سورۃ الاحقاف) کے مرکزی مضمون کے سیاق و سباق میں ہوا ہے۔ چنانچہ آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مضمون کے ذیلی عنوانات کی

ترتیب کو ایک دفعہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیا جائے۔ ان آٹھ سورتوں میں سے پہلی چار سورتوں (الزمر تا الشوریٰ) میں ’’توحیدِ عملی‘‘ کا مضمون ایک خاص ترتیب اور تدریج کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ سورۃ الزمر میں تکرار کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے: ﴿قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿١١﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے: مجھے حکم ہوا ہے کہ میں بندگی کروں اللہ کی اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے‘‘۔ اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر کسی اور کی اطاعت کرنا شرک ہے اور مخلوق میں سے کسی کی ایسی اطاعت کرنا بھی شرک ہے جس سے خالق کی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہو۔ اس کے بعد سورۃ المؤمن میں توحیدِ عملی کے داخلی پہلو (دعا) کو اُجاگر کیا گیا ہے اور بار بار حکم دیا گیا ہے: ﴿فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ کہ اللہ سے دعا کرو اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس طرح ان دونوں سورتوں میں توحیدِ عملی کا مضمون اپنے خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے ایک فرد کی حد تک مکمل ہو گیا ہے۔

اس کے بعد اگلی دو سورتوں (سورۂ حٰمٓ السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ) میں توحیدِ عملی کو فرد سے اجتماعیت کی طرف بڑھایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں توحید کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس دعوت کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾﴾ ’’اور اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں!‘‘ اس دعوت کا ذریعہ (medium) چونکہ قرآن ہے اس لیے اسی نسبت سے سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں قرآن کی عظمت کا ذکر تکرار کے ساتھ (چھ مرتبہ) آیا ہے۔ اس کے بعد سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون اقامت دین ہے۔ تدریج کے حوالے سے اس کی وضاحت یوں ہوگی کہ جو لوگ توحید کی دعوت پر لبیک کہیں انہیں منظم کر کے ایک قوت میں تبدیل کیا جائے۔ پھر یہ سب لوگ مل کر باطل کے تسلّط کو ختم کرنے اور معاشرے میں اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جدوجُہد کریں۔ اس طرح ان چار سورتوں میں ’’توحیدِ عملی‘‘ کے مضمون کو فرد سے لے کر ایک ترتیب اور تدریج کے ساتھ اجتماعی نظام کی سطح تک مکمل کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورۃ الزخرف اور سورۃ الجاثیہ میں اس مضمون (توحید فی الاطاعت) کے تقابل کے طور پر شرک فی الاطاعت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ سورۃ الزخرف میں اجتماعیت کی بلند ترین سطح

یعنی حاکمیت کی سطح کے شرک کا حوالہ ہے جبکہ سورۃ الجاثیہ میں (خصوصی طور پر آیت زیر مطالعہ میں) انفرادی سطح کے شرک کا ذکر ہے۔ جہاں تک اجتماعیت کی سطح پر شرک کا تعلق ہے اس کو یوں سمجھئے کہ ''انسانی حاکمیت'' کا تصور شرک کی بدترین شکل ہے' کیونکہ حاکم مطلق تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ سورۂ یوسف میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۴۰) کہ اختیارِ مطلق تو صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس حوالے سے سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت کا یہ اعلان: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ ''اور نہیں ہے اس کا کوئی شریک بادشاہی میں'' اور سورۃ الکہف کی آیت ۲۶ کے یہ الفاظ ﴿وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶﴾ ''اور وہ شریک نہیں کرتا اپنے حکم میں کسی کو بھی'' اپنے معانی و مفہوم میں بہت واضح ہیں۔ اب ایسے واضح احکام کے بعد اگر کوئی انسان ''حاکمیت مطلق'' کا دعویٰ کرے تو یہ گویا خدائی کا دعویٰ ہے اور یوں یہ شرک کی بدترین شکل ہے۔ اسی شرک کا علمبردار نمرود تھا اور اسی جرم کا مرتکب فرعون بھی ہوا تھا۔ سورۃ الزخرف میں فرعون کے نعرۂ شرک کا ذکر یوں آیا ہے: ﴿وَنَادٰي فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝۵۱﴾ ''اور فرعون نے اپنی قوم میں ڈھنڈورا پٹوا دیا' اس نے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی حکومت میری نہیں ہے اور یہ تمام نہریں میرے حکم کے تحت نہیں بہتی ہیں؟ تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟''

شرک فی الاطاعت کا دوسرا پہلو انفرادی ہے' جس کا ذکر آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔ اس آیت میں ایک ایسے شخص کی مثال بیان ہوئی ہے جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنے نفس کی خواہش پر چلنے کا طرزِ عمل اپنا رکھا ہے اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں اور اس کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھتا۔ ایسے شخص نے اپنے عمل سے گویا ثابت کر دیا ہے کہ اس کا معبود اللہ نہیں' بلکہ اس کا نفس ہے۔ اور وہ حقیقت میں اللہ کا نہیں اپنے نفس کا ''بندہ'' ہے۔ حضور ﷺ نے ایسے ہی شخص کو درہم و دینار کا بندہ قرار دیا ہے۔ آپ کا فرمان ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))[1] ''ہلاک ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ یہ دراصل وہ شخص ہے جو دولت کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور حلال و حرام کی تمیز کو بالکل پسِ پشت ڈال چکا ہے۔ اب اس کے والدین نے اس کا نام ''عبدالرحمٰن'' ہی کیوں نہ رکھا ہو' لیکن اس کے عمل سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں وہ ''عبدالدینار'' ہے۔

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد و السیر' باب الحراسة فی الغزو' ح: ۲۸۸۷۔

بہر حال سورۃ الزخرف میں شرک فی الاطاعت کا ذکر معاشرے کی بلند ترین سطح یعنی ریاست اور حاکمیت کی سطح پر ہوا ہے' جبکہ زیر مطالعہ سورت کی اس آیت میں اس کی دوسری انتہا یعنی انفرادی سطح کے شرک کا بیان ہے۔ شرک کی باقی تمام صورتیں ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہیں۔ آیت میں استفسار کے اسلوب سے زورِ کلام خاص طور پر زیادہ ہو گیا ہے کہ کیا آپ نے کبھی ایسے شخص کی عبرتناک حالت پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے؟

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰي عِلْمٍ﴾ ''اور اللہ نے اسے گمراہ کر رکھا ہے اس کے علم کے باوجود''

ہو سکتا ہے وہ کوئی بہت بڑا عالم ہو یا اعلیٰ پائے کا محقق ہو یا کوئی نامور سائنسدان ہو' مگر جس انسان نے اپنے نفس کا بندہ بن کر رہنا قبول کر لیا ہو اس کی علمی اہلیت' تحقیقی استعداد اور سائنٹیفک اپروچ اسے نہ تو اللہ کی اطاعت کی راہ دکھا سکتی ہے' اور نہ ہی اس کے دل کو ایمان اور اللہ کی معرفت کے نور سے منور کر سکتی ہے۔ ایسے بدقسمت لوگوں پر ہدایت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠﴾ (البقرۃ: ۷)۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت کے الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ دیکھئے یہاں بھی آ گئے ہیں:

﴿وَّخَتَمَ عَلٰي سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰي بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ﴾ ''اور اللہ نے اُس کی سماعت اور اُس کے دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔''

اس مہر اور اس پردے کی کیفیت کا عملی مشاہدہ کرنا ہو تو آج کے سائنسدانوں کو دیکھ لیجیے۔ انہوں نے سات سمندروں کے پانیوں کو کھنگال مارا ہے' روئے ارضی کے ذرّے ذرّے کی چھان پھٹک وہ کر چکے ہیں۔ خلا کی وسعتوں کے اندر دور دور تک وہ جھانک آئے ہیں۔ غرض سائنسی کرشموں کے سبب انہوں نے کائنات کے بڑے بڑے رازوں کو طشت از بام کر دیا ہے' لیکن اس پوری کائنات میں اگر انہیں نظر نہیں آیا تو ایک اللہ نظر نہیں آیا! مذکورہ ''پردہ'' ان کی آنکھوں پر اس قدر دبیز ہو چکا ہے کہ اس پوری کائنات میں کائنات کے خالق کا انہیں کہیں سراغ نہیں ملا۔

﴿فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۲۳﴾ ''تو اللہ کے (اس فیصلے کے) بعد اب کون اسے ہدایت دے سکتا ہے' تو کیا تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے؟''

آیات ۲۴ تا ۳۷

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا
الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ اِذَا
تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا
بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ
یَجْمَعُكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ
السَّاعَةُ یَوْمَىِٕذٍ یَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ
جَاثِیَةً ؕ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا یَنْطِقُ عَلَیْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا
نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَیُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ﴿۳۰﴾
وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰیٰتِیْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ
وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ
نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ ﴿۳۲﴾ وَ بَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا
عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ قِیْلَ الْیَوْمَ
نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ
غَرَّتْكُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ۚ فَالْیَوْمَ لَا یُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ
یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۶﴾ وَ لَهُ الْكِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۷﴾

آیت ﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا﴾ ''وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے (کوئی اور زندگی) سوائے ہماری دنیا کی زندگی کے، ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں''

اس ایک جملے میں یوں سمجھئے کہ دہریت اور مادّیت (Materialism) کی پوری حقیقت سمو دی گئی ہے۔ اس فلسفے کے مطابق اس کائنات کی اصل اور سب سے بڑی حقیقت مادّہ (matter) ہے، مادّے کے علاوہ کسی اور شے کا کوئی وجود نہیں، مادّے کی اپنی صفات ہیں، کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تبدیلی آتی ہے وہ مادّے کی ہیئت میں تبدیلیوں (physical and chemical changes) کے باعث ہی ممکن ہے۔ یہ کائنات مادّے سے خود ہی وجود میں آئی تھی اور مادّے کے اٹل قوانین کے باعث خود ہی چل رہی ہے۔ انسانی زندگی بھی انہی اٹل قوانین کے تابع ہے۔ انہی لگے بندھے قوانین کے تحت انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی طبعی عمر کے مطابق زندہ رہتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ نہ تو مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا کوئی امکان ہے۔ یہ فلسفۂ دہریت کے بنیادی نکات ہیں، جبکہ تجربیت پسندی بحیثیت نظریہ علم (Empiricism) اور منطقی اثباتیت (Logical Positivism) بھی اسی فلسفے کی ذیلی شاخیں ہیں اور مذکورہ نکات ان سب کے ہاں مشترک ہیں۔

﴿وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ ''اور ہمیں نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ''

کہ ہم تو محض زمانے کی گردش سے ہلاک ہوتے ہیں۔ نہ تو کوئی اللہ ہے جو انسانوں کی موت کے پروانے جاری کرتا ہو اور نہ ہی کسی فرشتے وغیرہ کا کوئی وجود ہے جو آ کر کسی کی جان قبض کرتا ہو۔

﴿وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''حالانکہ ان کے پاس (اس بارے میں) کوئی علم نہیں ہے، وہ تو صرف ظن سے کام لے رہے ہیں۔''

محض اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں۔

آیت ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور جب انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ہماری روشن

آیات تو نہیں ہوتی ان کی کوئی دلیل سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ (زندہ کر کے) لے آؤ ہمارے آباء واَجداد کو اگر تم سچے ہو!''

اس ضمن میں ان کے پاس واحد حجت اور دلیل یہی ہوتی ہے کہ چلو اگر تم ہمارے فوت شدہ آباء واَجداد کو زندہ کر کے ہمارے پاس لے آؤ تو ہم بعث بعد الموت کے تمہارے دعوے کو مان لیں گے۔

آیت ﴿قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے' پھر وہی تمہیں موت دے گا''

کہ میں نے تو کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں کسی کو زندہ کروں گا۔ ہر کسی کی زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اب وہ حضرات جو اس کائنات اور انسانی زندگی کو مادّیت اور دہریت کی عینک سے دیکھتے ہیں' انہیں یہ بات بھلا کیونکر سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہم اس سے پہلے ایک زندگی اور ایک موت کے مراحل طے کر کے اس دنیا میں آئے ہیں! (وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: سورۃ المؤمن' تشریح آیت ۱۱)

﴿ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶﴾ ''پھر تمہیں جمع کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں' لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔''

آیت ۲۷ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۲۷﴾ ''اور جس دن قیامت قائم ہوگی اُس دن جھٹلانے والے بڑے خسارے میں ہوں گے۔''

جو لوگ حق کو باطل قرار دے رہے ہیں' روزِ محشر انہیں عظیم خسارے کا سامنا کرنا ہوگا۔

آیت ۲۸ ﴿وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۚ﴾ ''اور تم دیکھو گے کہ ہر اُمت گھٹنوں کے بل پڑی ہوگی۔''

﴿كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ﴾ ''ہر اُمت کو بلایا جائے گا اس کے اعمال نامے کی طرف۔''

وہاں سرِ محشر باری باری ندا ہوگی کہ فلاں قوم کو لے آیا جائے اور ان کا اعمال نامہ پیش کیا جائے۔

﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸﴾ ''آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا ان اعمال کا جو تم کرتے رہے ہو۔''

آیت ۲۹ ﴿هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''یہ ہمارا (تیار کردہ) اعمال نامہ ہے جو تمہارے اوپر حق کے ساتھ گواہی دے گا۔''

یہ وہ ریکارڈ ہے جس میں ہم نے تمہارے ایک ایک عمل کو محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ ابھی تمہاری ایک ایک حرکت کی ٹھیک ٹھیک تفصیل بتا دے گا اور تمہارے خلاف بالکل ٹھیک ٹھیک گواہی دے گا۔

﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۹﴾ ''جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم اُسے لکھواتے جا رہے تھے۔''

اس ''لکھنے'' کے مفہوم میں بہت وسعت اور جامعیت ہے۔ عام طور پر ہمارا ذہن لکھنے کے انسانی طور طریقوں کی طرف جاتا ہے۔ لیکن ان طریقوں میں بھی دیکھتے ہی دیکھتے ایسی تبدیلیاں آچکی ہیں جن کے بارے میں زمانہ ماضی میں کبھی ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ ہم قلم اور دوات سے لکھا کرتے تھے مگر آج اس سے کہیں بہتر لکھائی کمپیوٹر کے ذریعے سے ہو جاتی ہے۔ پھر آڈیو/ ویڈیو ریکارڈنگ بھی تحریر ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے ہاں کی لکھائی کا تصور ہمارے ذہن سے بہت بالا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر انسان کی زندگی کے ایک ایک عمل اور ایک ایک لمحے کی تفصیلی روداد تیار ہو رہی ہے۔ وقت آنے پر بس ایک اشارہ ہوگا اور متعلقہ انسان کی زندگی کی مکمل تصویر سامنے آجائے گی۔

آیت ۳۰ ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''پس جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے''

﴿فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝۳۰﴾ ''تو ان کو داخل کر دے گا ان کا پروردگار اپنی رحمت میں۔ یہ بہت واضح کامیابی ہوگی۔''

آیت ۳۱ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫﴾ ''اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا''

﴿اَفَلَمۡ تَكُنۡ اٰيٰتِيۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ﴾ ''(ان سے اللہ پوچھے گا کہ) کیا تمہیں میری آیات پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں؟''

اس آیت میں اگرچہ کفار کا ذکر ہے' لیکن اس مفہوم کی آیات کے حوالے سے یہ اہم نکتہ مدِنظر رہے کہ ہم بھی جب قرآن سنتے ہیں تو اپنے اور پڑھ کر سنانے والے کے بارے میں اس جملے کا مفہوم ضرور یاد رکھنا چاہیے۔ اسی طرح ان سطور کو پڑھنے والے ہر قاری کے ذہن میں بھی یہ تصور ضرور ہونا چاہیے کہ قرآن کا پیغام اس تک پہنچ گیا ہے اور وہ اس کے بارے میں ضرور مسئول ہوگا۔

﴿فَاسۡتَكۡبَرۡتُمۡ وَ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّجۡرِمِيۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ''تو تم نے استکبار کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔''

ہماری آیات کے آگے سر جھکانے اور ہمارے احکام کو تسلیم کرنے کے بجائے تم نے استکبار کا رویہ اپنایا' اس لحاظ سے واقعی تم بہت بڑے مجرم تھے۔

آیت ۳۲ ﴿وَاِذَا قِيۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيۡبَ فِيۡهَا﴾ ''اور جب کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور قیامت آنے میں کوئی شک نہیں''

﴿قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِىۡ مَا السَّاعَةُ﴾ ''تو تم کہتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے''

السّاعۃ (قیامت کی موعودہ گھڑی) کا ذکر سن کر تم کہا کرتے تھے کہ ہم کسی ساعت واعت کو نہیں جانتے۔ تمہارے یہ گستاخانہ جملے ہمارے پاس ریکارڈ میں موجود ہیں۔

﴿اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا﴾ ''ہاں ہمیں ایک گمان سا تو ہوتا ہے''

لیکن کبھی کبھی تم قیامت کا ذکر سن کر یوں بھی کہا کرتے تھے کہ ہاں قیامت کے قائم ہونے اور آخرت کی زندگی کے بارے میں ہمیں گمان سا تو ہوتا ہے' ایک خیال سا تو آتا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ نیکی و بدی کے فرق اور سزا و جزا کی منطق کو تم لوگ خوب سمجھتے تھے۔ تم جانتے تھے کہ پیشہ ور مجرم اور نیک لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔ کبھی کسی مظلوم کی بے بسی کو دیکھ کر تمہارے ذہن میں یہ سوال بھی چپک جاتا تھا کہ اس بے چارے کی کہیں تو دادرسی ہونی چاہیے اور کبھی کبھی تمہارا ضمیر تمہیں یہ بھی یاد دلایا کرتا تھا کہ ظالموں کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے کوئی مؤثر اور قطعی نظام تو ضرور ہونا

چاہیے۔ لیکن پھر دُنیوی مفادات کی یلغار کو اپنے سامنے پا کر ایسی ہر سوچ کو مفروضہ قرار دے کر تم جھٹک دیا کرتے تھے۔

﴿وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

یہاں پر ''یقین'' کا لفظ بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ دراصل ''آخرت'' کو ایک رسمی نظریے کے طور پر تسلیم کر لینا کافی نہیں۔ اس ''ایمان'' کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے اس کے بارے میں دل میں گہرا یقین ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک دل میں بعث بعد الموت اور آخرت کا پختہ یقین نہیں ہوگا انسان کا کردار درست نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں متقین کی صفات کے حوالے سے جہاں غیب اور الہامی کتب پر ''ایمان لانے'' کی شرط کا ذکر ہے وہاں آخرت کے بارے میں ''یقین رکھنے'' کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے: ﴿وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾﴾۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے بارے میں دل کے اندر گہرا یقین رکھے بغیر مقامِ تقویٰ تک پہنچنا ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ کے الفاظ میں ہمیں اپنی باطنی کیفیت کی جھلک بھی نظر آئے گی۔ ہم موروثی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک عقیدے کے درجے میں تو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں' لیکن کیا دوبارہ جی اٹھنے اور اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کا پختہ یقین ہمارے دلوں میں موجود ہے؟ اس سوال کا جواب ہم میں سے ہر شخص کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں جھانک کر تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یقین کی مطلوبہ کیفیت تک کیسے پہنچا جائے تو اس کا جواب ہمیں سورۃ الحدید کے مطالعہ کے دوران ملے گا۔

آیت ۳۳ ﴿وَبَدَا لَهُمۡ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوۡا﴾ ''اور ان کے سامنے آ جائیں گے ان کے وہ تمام بُرے اعمال جو انہوں نے کیے تھے''

﴿وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''اور انہیں گھیرے میں لے لے گی وہی چیز جس کا وہ استہزا کیا کرتے تھے۔''

دنیا میں وہ لوگ جہنم کا مذاق اڑایا کرتے تھے' چنانچہ وہی جہنم انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے وہاں موجود ہوگی۔

آیت ۳۴ ﴿وَقِيۡلَ الۡيَوۡمَ نَنۡسٰىكُمۡ كَمَا نَسِيۡتُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا﴾ ''اور ان

سے کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمہیں اسی طرح نظر انداز کر دیں گے جیسے تم نے اس دن کی ملاقات کو نظر انداز کر رکھا تھا‘‘

﴿وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۴﴾ ’’اور تمہارا ٹھکانہ اب آگ ہے اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہیں ہے۔‘‘

چنانچہ اب تمہارے رونے دھونے اور چیخنے چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تمہیں اس عذاب سے چھڑانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔

آیت ۳۵ ﴿ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ﴾ ’’یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنا لیا تھا اور دنیا کی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا۔‘‘

﴿فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۳۵﴾ ’’تو آج انہیں نکالا نہیں جائے گا اس سے اور نہ ہی انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ توبہ کر لیں۔‘‘

اب ان کے لیے موقع نہیں ہوگا کہ معافی مانگ کر اپنے ربّ کو راضی کر لیں۔ توبہ کا موقع تو دنیا میں تھا اور وہ موقع وہ لوگ کھو چکے ہوں گے۔

آیت ۳۶ ﴿فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۶﴾ ’’پس کُل تعریف اور کُل شکر اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں کا اور زمین کا رب ہے اور تمام جہانوں کا رب ہے۔‘‘

آیت ۳۷ ﴿وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳۷﴾ ’’اور اسی کے لیے ہے بڑائی آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہی ہے زبردست‘ حکمت والا۔‘‘

اللہ اکبر! یقیناً اللہ سب سے بڑا ہے! وہ آسمانوں میں بھی سب سے بڑا ہے اور وہ زمین میں بھی سب سے بڑا ہے۔ مگر زمین میں عملی طور پر اسے بڑا نہیں مانا جا رہا۔ زمین میں اللہ کے بندے اللہ سے بغاوت کر چکے ہیں۔ وہ اللہ کے قوانین کو پس پشت ڈال کر اپنی مرضی کی قانون سازی کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ کسی ملک کے عوام ہی اس کے اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کے اصل مالک ہیں۔ لیکن یاد رکھیے! ’’حاکمیت‘‘ کا یہی دعویٰ سب سے بڑا کفر اور سب سے بڑا شرک

ہے‘ چاہے یہ دعویٰ فردِ واحد کرے یا پوری قوم مل کر کرے۔ اس حوالے سے بائبل میں موجود Lord's Prayer کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ اس دعا میں اسی دعوے کو ختم کرنے‘ اسی کفر و شرک کو مٹانے اور آسمانوں کی طرح زمین پر بھی اللہ کی مرضی نافذ کرنے کا ذکر ہے:

Thy Kingdom come
Thy will be done on Earth
As it is in Heavens

کہ اے اللہ! تیری بادشاہت آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمانوں میں پوری ہو رہی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پوری ہو۔ آسمانوں کی مخلوق تو تیرے احکام کو من و عن تسلیم کرتی ہے۔ سورج تیری مرضی کے مطابق رواں دواں ہے۔ چاند تیرے حکم کا تابع ہے اور تمام کہکشائیں تیری مشیت کے سامنے سرنگوں ہیں‘ لیکن ایک زمین ہے کہ جس کے بحر و بر کو انسان نے اپنے کرتوتوں کے سبب فساد سے بھر دیا ہے: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱) ..... اس لیے ضروری ہے کہ اللہ کی مرضی جیسے آسمانوں پر نافذ ہے ویسے ہی زمین پر بھی نافذ ہو۔ زمین پر بھی اللہ کے حکم کو سپریم لاء کا درجہ حاصل ہو۔ اسی قانون کے مطابق فیصلے ہوں۔ اسی کیفیت کا نام ’’اقامتِ دین‘‘ ہے‘ جس کے لیے ’’تنظیمِ اسلامی‘‘ جدّوجُہد میں مصروف ہے۔ ❁❁❁

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس

• فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد

صفحات:120 قیمت:90روپے

دعوتِ قرآنی کا لُبِّ لُباب

اور

نبی اکرم ﷺ کے جانب خصوصی التفات

کے ضمن میں

داعیانِ حق کو جامع ہدایات

خواتیم سورۃ الاعراف کی روشنی میں

یعنی سورۃ الاعراف کی آخری گیارہ آیات کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کی چار تقاریر

جو ماہِ جنوری ۱۹۷۹ء کے دوران ہر جمعہ کی صبح ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئیں

(۱)

سورۃ الاعراف کی آیات ۱۹۶ تا ۱۹۸ حسب ذیل ہیں:

﴿اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ ۚ وَہُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَہُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْہُمْ اِلَی الْہُدٰی لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىہُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَہُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾﴾

’’یقیناً میرا حامی و کارساز اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے‘ اور وہ تمام نیکوکاروں

کا کارساز و مددگار ہے۔ اور اسے چھوڑ کر جنہیں تم پکارتے ہو‘ وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی۔ اور اگر تم ان کو رہنمائی کے لیے پکارو تو وہ تمہاری بات سن بھی نہیں سکتے۔ تمہاری رائے میں وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں‘ حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے!‘‘

سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف دونوں کے مرکزی مضامین توحید و رسالت اور بنی اسمٰعیل پر بالخصوص اور جمیع اہلِ عرب پر بالعموم اتمامِ حجت ہیں۔ اور سورۃ الاعراف کے اس آخری حصے میں ان تمام کا ایک مختصر مگر جامع خلاصہ بیان ہوا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا ہے‘ ان آیات میں توحیدِ الٰہی کا لُبِّ لُباب بھی آ گیا ہے‘ اور جملہ انواع و اقسامِ شرک خصوصاً اصنام پرستی کا رد بھی بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ہو گیا ہے۔

توحید یا ایمان باللہ کا لُبِّ لُباب اور اصل حاصل اللہ تعالیٰ پر کامل توکّل اور اس کی نصرت و حمایت اور دستگیری و کارسازی پر مکمل اعتماد ہے‘ جس کے نتیجے میں بندے اور رب کے مابین باہمی محبّت و دوستی کا وہ دوطرفہ تعلق استوار ہوتا ہے‘ جسے اصطلاحِ دین میں ’ولایت‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عظیم ثمرہ دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں خوف اور حزن سے کامل رُستگاری ہے۔

اس عالَمِ اسباب میں زندگی بسر کرتے ہوئے انسان اپنے آپ کو تاثر و انفعال کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں غوطے لگاتے پاتا ہے اور ہر چہار طرف سے خطرات و خدشات اور مصائب و مشکلات میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ یہ کبھی آفاتِ سماویہ کی زد میں ہوتا ہے تو کبھی مصائب ارضی اسے گھیر لیتے ہیں‘ کبھی اَغیار و اعداء کے ہاتھوں صدمے سہتا ہے تو کبھی خود اپنوں کے ہاتھوں دکھ اٹھاتا ہے۔ کبھی ظاہری اور جسمانی تکلیفیں اسے پریشان کرتی ہیں‘ تو کبھی ذہنی کوفت‘ قلبی اذیت اور نفسیاتی کرب اس کا نصیب بنتے ہیں۔ الغرض اس دکھ بھری دنیا میں جہاں قدم قدم پر خدشوں اور اندیشوں کا سامنا رہتا ہے‘ انسان کو ایسے مخلص ہمدم و رفیق‘ قوی حامی و مددگار اور قابلِ اعتماد دستگیر اور کارساز کی ضرورت کا شدّت سے احساس ہوتا ہے‘ جس کی نصرت و حمایت پر وہ پورا بھروسہ کر سکے! انسان کی یہ فطری ضرورت‘ اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین کے ذریعے تمام و کمال پوری ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ بندۂ مؤمن یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ اُس کا حامی و ناصر ہے۔ اور ایک طرف تو قَوِی و عَزِیْز اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ہے‘ لہٰذا زمین و آسمان کی کوئی چیز اُس کی مرضی کے علی الرغم نہ کوئی گزند پہنچا سکتی ہے نہ نقصان‘ بقولِ شاعر: ’’دشمن اگر قوی ست نگہباں قوی تر

است!'' —— دوسری طرف وہ سَمِیۡعٌ وَ بَصِیۡرٌ اور بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ہے اور ظاہر و باطن اور حاضر و غائب سب کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا ہمارے نفع و نقصان کو ہم سے بڑھ کر جاننے والا اور ہماری مصلحتوں سے ہم سے بڑھ کر واقف ہے۔ پھر وہ ہر آن اور ہر جگہ موجود بھی ہے۔ گویا اُس کے ماننے اور چاہنے والوں اور اس کی پناہ میں آ جانے والوں کو اس کی دائمی معیت حاصل ہو جاتی ہے' بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ۚ﴾ (الحدید:۴) ''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے!'' —— یہ ہے فی الجملہ ''ولایتِ الٰہی'' کی کیفیت جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ وہی ہے جو اس مشہور آیت میں بیان ہوا ہے کہ:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾﴾ (یونس)

''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی انہیں حزن سے سابقہ پیش آتا ہے۔''

گویا ایمان باللہ یا توحید کامل کے ذریعے انسان کی وہ فطری ضرورت جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے باحسن وجوہ پوری ہو جاتی ہے اور بتمام و کمال بھی! اب جن لوگوں کی رسائی معرفت الٰہی تک نہیں ہو پاتی وہ بھی اپنی اس فطری ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی نہ کسی کو جھوٹ موٹ کا حامی و مددگار بنا کر کسی درجے میں ذہنی سہارا بنا لیتے ہیں' اور ان سے مدد کی درخواست کر کے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر کبھی دیویوں اور دیوتاؤں اور gods اور godesses کے لشکر کے لشکر اختراع کر لیے گئے' جیسے ہندوستان اور یونان میں ہوا۔ کبھی گزرے ہوئے بزرگوں اور اللہ کے نیک بندوں کے خیالی مجسمے تراش لیے گئے اور ان سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی درخواستیں کی جانے لگیں' جیسے قومِ نوحؑ نے کیا' کبھی شمس و قمر اور ثوابت و سیاروں کے نام پر ہیکل تعمیر کر لیے گئے اور ان کے لیے مراسمِ عبودیت بجائے جانے لگے' جیسے قومِ ابراہیمؑ نے کیا۔ اور کبھی شجر و حجر حتیٰ کہ حشرات الارض تک کو مقدس مان کر ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی گئی۔ لیکن وائے ناکامی کہ شرفِ انسانیت سے اس طرح خود اپنے ہاتھوں محروم ہو جانے کے باوجود انسان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا اور اس کی حالت اس مسافر کی سی ہو گئی کہ: ع ''غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!''

ایمان باللہ کے مضبوط سہارے اور توحیدِ الٰہی کے ''عروۂ وثقیٰ'' سے محروم انسان کا نقشہ سورۃ

الحج کی آیات ۱۵ اور ۳۱ میں نہایت خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ آیت ۱۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَن كَانَ يَظُنُّ أَن لَّن يَنصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهُ مَا يَغِيظُ ﴿١٥﴾﴾

''جو شخص دنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت و حمایت کی اُمید کا رشتہ توڑ بیٹھا ہو وہ ذرا آسمان کی طرف ایک رسّی تانے اور پھر اسے کاٹ دے اور دیکھے کہ کیا اس سے اس کی تشویش میں کوئی کمی آئی!''

اور آیت ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ﴿٣١﴾﴾

''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے' وہ ایسے ہے جیسے آسمان سے گر پڑا ہو اور اب خواہ اسے پرندے اُچک لے جائیں' خواہ ہوا اسے کسی دور دراز مقام پر لے جا کر پٹخ دے۔''

گویا اللہ تعالیٰ پر یقین اور اس پر توکّل و اعتماد کا تعلق' جو توحید کا اصل ثمرہ ہے' اس رسی کے مانند ہے جس سے کوئی انسان کسی مقامِ بلند سے لٹکا ہوا ہو' اور جسے مضبوطی سے تھامے رکھنے ہی میں خیریت اور عافیت کی واحد صورت مضمر ہو' بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے اور پھر اللہ پر ایمان لائے تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا' جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔''

اور شرک کی مثال ایسے ہے کہ کسی اور خیالی اور موہوم سہارے کے دھوکے میں انسان اس رسی کو چھوڑ بیٹھے اور فضا میں پٹخنیاں کھانے لگے۔ نتیجتاً اس واحد حقیقی و واقعی سہارے سے محرومی کے بعد اب وہ کلیتاً شکاری پرندوں کے رحم و کرم پر ہو کہ جیسے چاہیں تِکّا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے رحم و کرم پر کہ جہاں چاہیں لے جا گرائیں۔

آیات زیر درس میں بھی اس فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا ہے کہ:

﴿إِنَّ وَلِيِّيَ اللَّهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾ وَالَّذِينَ

تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾

(الاعراف)

''یقیناً میرا حامی و ناصر اور مددگار و کارساز تو اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے اور وہ نیکوکار بندوں کی حمایت و مدد کرتا ہے۔ البتہ جنہیں تم پکار رہے ہو (ان کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں) وہ تمہاری مدد تو کیا کریں گے' خود اپنی مدد سے بھی قاصر محض ہیں۔''

حیاتِ نبوی ﷺ کے دوران ہو بہو یہی نقشہ دامنِ اُحد میں کھنچ گیا تھا' جب حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے' جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور لشکرِ کفار و مشرکین کے سپہ سالار تھے' نعرہ لگایا: ''اُعْلُ ھُبَل'' —— تو آنحضور ﷺ نے جواب دلوایا کہ: ''اللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَل'' اور پھر جب اُدھر سے نعرہ لگا: ''لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ!'' —— تو ادھر سے جواب دیا گیا کہ ''اللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ'' ''ہمارا مولا و مددگار اور حامی و ناصر تو اللہ عزوجل ہے جبکہ اے مشرکو اور کافرو! تمہارا کوئی حامی و ناصر ہے نہ کارساز و دستگیر!!!

انسان کو جہاں دوسری بہت سی احتیاجات لاحق ہیں' چنانچہ بطن و فرج کے تقاضے بھی ہیں اور کام و دہن کے بھی' اور تن ڈھانپنے کی ضرورت بھی ہے اور سر چھپانے کی بھی' وہاں بحیثیت حیوان عاقل و اشرف المخلوقات اس کی سب سے بڑی ضرورت عقلی و ذہنی رہنمائی اور فکری و نظری ہدایت ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجرائے وحی اور انزالِ کتب کا سلسلہ جاری فرمایا اور نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا۔ چنانچہ آخری اور مکمل کتاب اور کامل و ابدی رہنمائی ہے قرآن مجید اور آخری نبی اور کامل رسول ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کلام میں بھی اللہ نے اسی انعامِ عظیم اور نعمتِ کبریٰ کا حوالہ دیا کہ ﴿اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ ۫﴾ ''میرا حامی و کارساز تو وہ اللہ ہے جس نے تنزیل کتاب کا اہتمام فرمایا'' اور قرآن مجید کی صورت میں اپنا ازلی و ابدی کلام مجھ پر نازل فرمایا' جو گویا: ع ''از کجامی آید ایں آوازِ دوست!'' کے مصداق اپنے ماننے اور چاہنے والوں کے لیے شہنشاہِ ارض و سماء کے عظیم ترین ہدیہ و انعام اور اس کی 'رحمانیت' کا سب سے بڑا مظہر ہے' بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾﴾ (الرحمٰن)

آیات زیر درس میں اس اعتبار سے بھی مشرکین کی محرومی کا بڑا حسرت ناک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جہاں تمہارے لیے حامی و ناصر کوئی نہیں' وہاں ہادی و رہنما بھی کوئی نہیں! اور اگر تم اپنے

مزعومہ خداؤں اور موہومہ معبودوں سے ہدایت چاہو گے اور رہنمائی کے طالب ہو گے تو اس معاملے میں بھی سوائے حرمان و یاس کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس لیے کہ وہ تو بیچارے سن بھی نہیں سکتے' کجا یہ کہ تمہیں رستہ دکھائیں اور تمہاری رہنمائی کریں۔ اس ضمن میں خاص طور پر اصنام پرستوں کی خوش عقیدگی کا پردہ چاک کر دیا گیا کہ بظاہر تو تم یہ محسوس کرتے ہو گے کہ تمہارے یہ بت تمہیں دیکھ رہے ہیں' لیکن عقل کے اندھو' ذرا سوچو کہ ان پتھریلی آنکھوں میں بصارت کہاں! —— کاش کہ تمہیں ہی بصیرت کی کوئی رمق نصیب ہو جائے۔

ان تین آیات میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں وہ اس سے قبل اسی سورت کی آیات ۱۹۱ تا ۱۹۳ میں بھی آ چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں فرمایا گیا تھا:

﴿اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَھُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَتَّبِعُوْکُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْکُمْ اَدَعَوْتُمُوْھُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾﴾

''کیا یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں انہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ خود مخلوق ہیں' اور نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں نہ اپنی۔ اور اگر تم ان سے طالب ہو ہدایت کے تو پلٹ کر جواب تک نہیں دے سکتے۔ تمہارے حق میں بالکل برابر ہے' خواہ انہیں پکارو یا خاموش رہو!''

اللہ ربّ العزت ہمیں شرک کی ہر صورت سے بچائے اور اپنی ذاتِ تبارک و تعالیٰ پر کامل یقین و ایمان اور توکل و اعتماد پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین○

(۲)

سورۃ الاعراف کی آیات ۱۹۹ تا ۲۰۲ حسبِ ذیل ہیں:

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَاِخْوَانُھُمْ یَمُدُّوْنَھُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) عفو و درگزر کی روش اختیار کرو' نیکی اور بھلائی کی تلقین کیے جاؤ اور

جاہلوں کے منہ نہ لگو! اور اگر کبھی شیطان کے وسوسے اور اُکساہٹ سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو اللہ کی پناہ چاہو‘ یقیناً وہ سب کچھ سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ بے شک اللہ کے نیک بندوں کو جب کوئی شیطانی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے تو وہ چوکنے ہو جاتے ہیں اور فوراً ہی انہیں سوجھ حاصل ہو جاتی ہے۔ رہے ان (شیطانوں) کے بھائی تو انہیں تو وہ گمراہی و کج روی میں بڑھاتے ہی رہتے ہیں اور (ان کی تباہی و بربادی میں) کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔‘‘

یہ سورۃ الاعراف کے آخری حصے کی آیات ہیں اور اس کے بعد صرف چار آیات اور ہیں‘ اور مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق ان میں بھی نبی اکرم ﷺ کی جانب خصوصی التفات ہے۔ اور ان حالات کے مطابق کہ جن سے آپؐ اس وقت دوچار تھے جب یہ سورت نازل ہوئی تو آپؐ کو چار واضح ہدایات دی گئی ہیں‘ جن میں ہر اُس شخص کے لیے ابدی رہنمائی ہے جو آپؐ کے اتباع میں دعوت الی اللہ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرے!

پہلی ہدایت ہے: ’’عفو و درگزر کی روش اختیار کرو!‘‘ یہ دعوتِ حق کی راہ کا پہلا سنہری اصول ہے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ دعوتِ خیر کی ضرورت وہیں پیش آتی ہے جہاں شر کا غلبہ ہو‘ اور اللہ کی طرف بلانے کی سعی میں ان ہی لوگوں سے خطاب ہوتا ہے جو خدا سے غافل ہو کر جذبات اور خواہشات و شہوات کی پیروی میں مگن ہوں۔ ایسے لوگ لہو و لعب اور عیاشی و لذّت کوشی کے اس درجہ رسیا ہو چکے ہوتے ہیں کہ انہیں چھوڑنا تو درکنار ان کے خلاف کچھ سننا تک انہیں گوارا نہیں ہوتا‘ بلکہ وہ: ﴿بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝﴾ (القیامۃ) کے مصداق چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے حال میں ہی مست رہنے دیا جائے۔ لہٰذا آغاز میں حق و صداقت اور خیر و صلاح کی دعوت پر ان کا ردعمل بہت شدید ہوتا ہے اور وہ داعیانِ خیر کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر داعیِ حق کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ صبر کرے‘ اور نہ تو لعن طعن کی روش اختیار کرے‘ نہ دل برداشتہ ہو کر دعوت ہی سے کنارہ کش ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آغاز میں آنحضور ﷺ کو صبر کی پیہم اور مسلسل اور بار بار و پے بہ پے تلقین کی گئی۔ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (آیت ۱۰) ’’(اے نبی ﷺ!) صبر کرو اُس پر جو یہ کہہ رہے ہیں!‘‘ سورۃ المدثر میں فرمایا: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝﴾ ’’اور اپنے رب کے لیے صبر کرو!‘‘ اور سورۃ القلم میں ارشاد ہوا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (آیت ۴۸) ’’اور اپنے رب کے حکم کے انتظار

میں صبر کیجیے۔‘‘ کہیں فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف:۳۵) ’’صبر کیجیے جیسے ہمارے دوسرے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا‘‘ و قِس علٰی ھذا۔

سورۃ الاعراف کے اس مقام پر اس سے بھی آگے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں پر صبر کیا جائے‘ بلکہ ان کو باقاعدہ معاف کیا جاتا رہے اور دل میں بھی ان کی جانب سے کسی کدورت کو راہ نہ دی جائے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے بھی ان کے لیے استغفار کیا جاتا رہے اور ان کی ہدایت کے لیے دعا کی جاتی رہے۔ چنانچہ اسی شان کا تمام و کمال ظہور ہوا فتح مکہ کے دن کہ آنحضور ﷺ نے جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے لیے عام معافی کا اعلان فرما دیا کہ: ((لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ‘ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)) (رواہ ابن اسحاق فی السیرۃ) ’’تم پر آج کوئی ملامت بھی نہیں‘ جاؤ تم سب آزاد ہو!‘‘ اور اسی کا ظہور ہوتا تھا مکی دور میں بار بار جب لوگ آپ ﷺ کو ستاتے تھے اور ہر ممکن طریق پر تکلیف پہنچاتے تھے اور آپ ﷺ اللہ سے دعا فرمایا کرتے تھے: اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ! ’’اے اللہ! میری قوم کو ہدایت فرما‘ یہ جانتے نہیں۔‘‘

دوسری ہدایت اس مقصد کو واضح کر رہی ہے جس کے لیے یہ صبر و ثبات اور عفو و درگزر مطلوب ہے۔ یعنی: ’’نیکی اور بھلائی کی تلقین کیے جاؤ!‘‘ اور ان کے رویہ سے دل برداشتہ ہو کر اپنے فرضِ منصبی سے دستکش نہ ہو جاؤ۔ اس ضمن میں لفظ ’’عُرف‘‘ بہت قابلِ توجہ ہے۔ حکمت قرآنی کی رو سے انسان کو جہاں ظاہری بصارت سے نوازا گیا ہے وہاں ایک باطنی بصیرت بھی عطا کی گئی ہے جس کی بنا پر وہ نیکی اور بھلائی کو بھی خوب پہچانتا ہے اور بدی اور برائی کو بھی جانتا ہے۔ بلکہ اس کی اصل فطرت نیکی کی طرف رغبت اور میلان رکھتی ہے اور بدی سے اِباء کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نیکی اور خیر کو ’معروف‘ سے تعبیر کرتا ہے اور بدی اور شر کو ’منکر‘ سے! برائی میں ملوث لوگوں کا مخالفانہ ردعمل بھی اس بنا پر نہیں ہوتا کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کرتے‘ بلکہ صرف اس لیے ہوتا ہے کہ برے ماحول کے اثرات اور ایک طویل عرصہ تک برائی میں ملوث رہنے کے باعث اس کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہوتے ہیں کہ اسے فوراً چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ لیکن اگر داعیانِ خیر‘ صبر و استقلال کے ساتھ دعوت دیتے چلے جائیں تو رفتہ رفتہ آنکھوں کے پردے بھی ہٹتے چلے جاتے ہیں اور دلوں کا زنگ بھی اترتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کل کے دشمن اور

خون کے پیاسے آج کے ہمدم و رفیق بلکہ جاں نثار بن جاتے ہیں‘ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ) ’’تو جس کے اور تمہارے مابین عداوت ہے وہ ایسے ہو جائے گا جیسے انتہائی گرم جوش ساتھی اور مددگار ہو۔‘‘

تیسری ہدایت بھی نہایت اہم ہے کہ: ’’جاہلوں سے اعراض کرو!‘‘ یعنی نہ ان کے منہ لگو نہ ان سے الجھو! واضح رہے کہ یہاں جاہل سے مراد اَن پڑھ نہیں ہے‘ بلکہ ’اَن گھڑ‘ ہے‘ یعنی کندۂ ناتراش یا وہ اکھڑ اور مشتعل مزاج انسان جسے عقل اور سوجھ بوجھ سے کوئی واسطہ نہ ہو‘ بلکہ اس کی لگام صرف جذبات و شہوات کے ہاتھ میں ہو۔ داعیانِ حق کے لیے لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے الجھنے سے بچیں‘ اس لیے کہ ان سے بحث و نزاع میں الجھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا‘ بلکہ الٹا وقت بھی ضائع ہوگا اور منزل بھی کھوٹی ہوگی۔ ایسے لوگوں سے اعراض ہی صحیح طرزِ عمل ہے‘ اور یہ اعراض بھی قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ اور حد درجہ حکیمانہ طرز پر ہونا چاہیے‘ جس سے نہ تو فوری طور پر کوئی بدمزگی پیدا ہو‘ نہ آئندہ بات کرنے کے مواقع ختم ہوں‘ جیسے کہ سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا ﴿۱۰﴾﴾ ’’ان سے علیحدگی اختیار کرو‘ لیکن یہ علیحدگی بھی خوبصورت ہو‘‘۔ اور سورۃ الفرقان میں عبادالرحمٰن کے اوصاف میں نہایت نمایاں طور پر بیان فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾﴾ ’’اور جب نادان لوگ ان سے اُلجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام!‘‘

چوتھی ہدایت اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ آنحضور ﷺ کو تو شاید ہی کبھی ایسا موقع پیش آیا ہو‘ لیکن دوسرے داعیانِ حق کے لیے اس کا ہر وقت امکان موجود ہے کہ شیطان کی اکساہٹ سے انہیں بھی غصہ آ جائے اور وہ بھی جاہلوں کے جواب میں کسی وقت مقامِ دعوت سے اتر کر برابر کی سطح پر آ جائیں اور اسی انداز میں جوابی حملہ شروع کر دیں۔ فرمایا کہ اگر ایسا کبھی ہو بھی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو اور شیاطینِ لعین کے حملے سے اللہ کی حفاظت کے مضبوط قلعے میں پناہ لے لو! اور یقین رکھو وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس لیے کہ اسی یقین میں داعیٔ حق کی تسلی اور دل دہی مضمر ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ مجھ سے یہ غلطی کن حالات میں سرزد ہوئی: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ﴾ (یوسف:۵۳) ’’اور میں ہرگز اپنے نفس کو بَری قرار نہیں دیتا‘ نفس کا تو کام ہی یہ ہے کہ بُرائی کا حکم دے!‘‘ اس ضمن

میں یہ قاعدہ کلیہ بھی ارشاد فرما دیا گیا کہ خدا ترس اور نیکوکار لوگوں کا تو طریقہ ہی یہ ہے کہ جب بر بنائے طبع بشری انہیں شیطان کی کوئی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے اور شیطان کے وسوسے اور اشتعال انگیزی سے طبیعت میں غصے کی آگ سلگنے لگتی ہے تو وہ فوراً متنبہ ہو جاتے ہیں اور انہیں احساس ہو جاتا ہے کہ شیطانِ لعین ان پر حملہ آور ہو رہا ہے‘ پس وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں‘ جس کے نتیجے میں نفس کی وہ طغیانی کافور ہو جاتی ہے اور انہیں دوبارہ مکمل سوجھ حاصل ہو جاتی ہے اور ان کا دل نورِ یقین سے از سرِ نو روشن ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس معاملہ ہے ان کا جو خود ہی شیطان کی پیروی اختیار کر کے اس کے بھائی بندوں میں شامل ہو جائیں۔ یہ لوگ شیطان کے لیے نہایت عمدہ تختۂ مشق بن جاتے ہیں‘ وہ انہیں ورغلاتا رہتا ہے اور بدی کے راستے پر آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے اور ان کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتا! ’’شیطانوں کے بھائی‘‘ کی اصطلاح قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی وارد ہوئی ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ﴾ (آیت ۲۷) ’’صرف نام و نمود کے لیے اللّوں تللّوں میں دولت لٹانے والے لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں!‘‘ اور یہ بات بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح کر دی گئی ہے کہ شیطانِ لعین کو کسی بھی انسان پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہاں جو لوگ خود ہی اس کی پیروی اختیار کر لیں وہ کلیتاً اس کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور گویا اس کے حوالے کر دیے جاتے ہیں کہ جس ہلاکت کے گڑھے میں چاہے جا گرائے۔ چنانچہ سورۃ الحجر میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ’’تجھے میرے بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا‘ سوائے اُن بہکے ہوئے لوگوں کے جو خود ہی تیری پیروی اختیار کر لیں!‘‘ فنعوذ باللہ العلیّ العظیم من الشیطٰن الرّجیم اللّعین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

(۳)

سورۃ الاعراف کی آیات ۲۰۳ تا ۲۰۴ حسب ذیل ہیں:

﴿وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ

رَبِّیۡ ۚ ہٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّکُمۡ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ وَ اِذَا قُرِیَٔ
الۡقُرۡاٰنُ فَاسۡتَمِعُوۡا لَہٗ وَ اَنۡصِتُوۡا لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) جب تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ اسے بھی کیوں نہ چھانٹ لائے! کہہ دو کہ میں تو بس اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرا رب مجھ پر نازل فرماتا ہے۔ یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھیں کھول دینے والی آیات اور رہنمائی اور رحمت ہیں' ان کے لیے جو ایمان لائیں۔ اور (دیکھو!) جب قرآن پڑھا جائے تو اسے دھیان سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم بھی رحمت خداوندی سے حصہ پاسکو!''

قرآن حکیم میں اکثر و بیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ بعض مقامات پر یہ نسبت و تعلق بہت نمایاں ہے' جیسے آخری دو سورتوں یعنی معوذتین میں اور پہلی دو مدنی سورتوں یعنی البقرۃ اور آل عمران میں' جنہیں آنحضور ﷺ نے ''الزہراوین'' یعنی دو انتہائی تابناک سورتیں قرار دیا ہے' اور بعض مقامات پر یہ نسبت ذرا خفی ہے۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف بھی طویل ترین مکی سورتوں کے ایک نہایت حسین و جمیل جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ الانعام کے آغاز میں ایک مضمون نہایت شرح و بسط سے بیان ہوا ہے' جس کا ایک نہایت مختصر لیکن حد درجہ جامع ملخص سورۃ الاعراف کے آخر کی ان دو آیات میں بیان کر دیا گیا ہے۔

وہ مضمون ہے کُفّارِ مکّہ اور سردارانِ قریش کا نبی اکرم ﷺ سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنی نبوت و رسالت کے ثبوت میں کوئی واضح معجزہ یعنی کھلی ہوئی حسّی نشانی دکھائیں' جسے وہ بچشمِ سر دیکھ سکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی اکرم ﷺ کا یہ جواب کہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جائے گا۔ ہدایت بندوں کی ضرورت ہے نہ کہ اللہ ربّ العزت کی۔ اور ہدایت کے قدردانوں اور طالبین کے لیے قرآن حکیم پوری طرح کفایت کرتا ہے' بحیثیت منبع ہدایت اور سرچشمۂ رہنمائی بھی' اور بحیثیت نشانی اور معجزہ بھی!

کفارِ قریش نبی اکرم ﷺ سے جس نوعیت کی نشانی کے طلب گار تھے اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:

﴿وَ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ یَنۡۢبُوۡعًا ﴿۹۰﴾ اَوۡ تَکُوۡنَ

لَکَ جَنَّۃٌ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡہٰرَ خِلٰلَہَا تَفۡجِیۡرًا ﴿۹۱﴾ اَوۡ تُسۡقِطَ
السَّمَآءَ کَمَا زَعَمۡتَ عَلَیۡنَا کِسَفًا اَوۡ تَاۡتِیَ بِاللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ قَبِیۡلًا ﴿۹۲﴾ اَوۡ
یَکُوۡنَ لَکَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰی فِی السَّمَآءِ ؕ وَ لَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِیِّکَ حَتّٰی
تُنَزِّلَ عَلَیۡنَا کِتٰبًا نَّقۡرَؤُہٗ ؕ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ ہَلۡ کُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۳﴾﴾

''وہ کہتے ہیں ہم ہرگز آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ زمین کو پھاڑ کر ہمارے لیے ایک چشمہ فی الفور جاری نہ فرما دیں۔ یا دفعتاً آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو جائے اور آپ اس میں جابجا نہریں رواں کر دیں۔ یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دیں' جیسا کہ آپ کا خیال ہے (کہ قیامت میں ہوگا) یا آپ اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں۔ یا آپ کے لیے فوراً سونے کا ایک محل بن جائے' یا آپ آسمان پر چڑھ کر دکھائیں اور آپ کے چڑھنے کو بھی ہم نہ مانیں گے جب تک آپ ہم پر ایسی کتاب نہ اتار لائیں جسے ہم خود پڑھ سکیں۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے پاک ہے میرا پروردگار' لیکن میرا دعویٰ اس کے سوا تو اور کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں جسے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے!!''

اس ضمن میں سردارانِ قریش نے نبی اکرم ﷺ کو جس درجہ زچ کر دیا تھا اور آپؐ جس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے' اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بظاہر اُن کا یہ مطالبہ درست اور معقول تھا کہ اگر آپؐ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپؐ کی نبوت و رسالت پر ایمان لائیں تو آپؐ پر لازم ہے کہ آپؐ ہمیں کوئی واضح نشانی ایسی دکھائیں جیسی کہ انبیائے سابقین دکھاتے رہے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ عصاء و یدِ بیضا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کہ مادرزاد اندھوں کو بینائی عطا فرما دیتے تھے اور مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے' اور مٹّی کے پرندے بنا کر پھونک مارتے تھے تو ان میں جان پڑ جاتی تھی اور وہ اڑنے لگتے تھے —— اب ظاہر ہے کہ ایسا کوئی معجزہ دکھانا کسی نبی یا رسول کی اپنی طاقت میں نہیں ہوتا' بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آل عمران میں جہاں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر ہے وہاں بار بار ''بِاِذْنِیْ'' کے الفاظ کی تکرار ہوئی ہے۔ اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں حکمت خداوندی میں یہ طے پا چکا تھا کہ آپؐ کو معنوی معجزہ تو وہ عطا کیا گیا جو کسی کو بھی نہیں دیا گیا یعنی قرآن حکیم' جس سے بڑا کوئی معجزہ ممکن ہی نہیں ہے اور جو ہمیشہ ہمیش قائم و دائم رہنے والا ہے —— لیکن

آپ ﷺ کی قوم کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جائے گا کہ انہیں کوئی حسّی معجزہ اور وہ بھی ان کے حسب منشاء دکھایا جائے۔ اس کا مثبت سبب تو یہ ہے کہ اب نوعِ انسانی عہدِ طفولیت سے نکل کر عقلی و شعوری بلوغ کے دور میں داخل ہو چکی ہے‘ لہٰذا اب اسے حسّی معجزات کے بجائے معنوی معجزے کے ذریعے حق کو پہچاننا چاہیے‘ اور منفی سبب یہ ہے کہ جو لوگ تکبّر یا حسد یا فسق و فجور کے عادی و خوگر ہونے کے باعث حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے ان کے لیے ایسے معجزے بھی بے سود رہتے ہیں اور ماضی میں بھی کفار و منکرین کے لیے اس قسم کے معجزے بجائے سودمند ہونے کے اُلٹے مضر ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ اللہ کا اٹل قانون یہ ہے کہ ایسے معجزات دیکھ لینے کے بعد بھی جو قوم ایمان نہیں لاتی وہ عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو کر رہتی ہے! الغرض یہ تھی وہ پیچیدگی یا dilemma جس سے آنحضور ﷺ دوچار تھے کہ ایک طرف سردارانِ قریش اپنے مطالبے کی ظاہری معقولیت سے عوام کو ورغلانے میں کامیاب ہو رہے تھے اور دوسری طرف اللہ کا اٹل فیصلہ تھا کہ جو ہدایت کا طلب گار ہے وہ اسی قرآن سے ہدایت حاصل کرے‘ کوئی خرقِ عادت معجزہ نہیں دکھایا جائے گا۔ اس صورت حال میں عین ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا ہو‘ اور کیا عجب کہ خود آنحضور ﷺ کے قلب مبارک میں بھی کبھی یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ کیوں نہ انہیں ایسا کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے‘ تاکہ اس کے بعد خواہ سردارانِ قریش ایمان نہ لائیں‘ بہرحال ان کی زبان تو بند ہو جائے گی اور عوام الناس پر جو اثر انہوں نے پیدا کر لیا ہے وہ تو ختم ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں سورۃ الانعام کی آیات ۳۳ تا ۳۷ میں ارشاد ہوا:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾﴾

’’(اے نبی ﷺ!) ہم خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں آپ کو اس سے دکھ پہنچتا ہے‘ لیکن (آپ غور کریں کہ) یہ لوگ آپ کو تو جھوٹا نہیں کہہ رہے‘ بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور (آپؐ کو معلوم ہی ہے کہ) آپؐ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا تھا تو انہوں نے اس تکذیب و ایذا پر صبر کیا‘ یہاں تک کہ ہماری مدد آ پہنچی‘ اور اللہ کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا‘ اور گزشتہ پیغمبروں کے حالات آپؐ کو معلوم ہی ہو چکے ہیں۔ اور اگر ان کا اعراض آپؐ پر گراں گزر رہا ہے تو اگر آپؐ کے لیے ممکن ہے تو آپؐ زمین میں کوئی سرنگ کھود کر یا آسمان پر سیڑھی لگا کر ان کے لیے کوئی نشانی لے آئیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا‘ پس آپؐ جذبات سے مغلوب ہونے والوں میں سے نہ بنیں۔ ایمان تو صرف وہی لائیں گے جو (فی الواقع) سنتے ہیں۔ رہے مردے تو اللہ ہی انہیں اٹھائے گا‘ اور پھر یہ اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے! یہ کہتے ہیں ’ان پر ان کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی!‘ ان سے کہہ دیجیے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ نشانی اتار دے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔‘‘

اور یہی مضمون ہے جس پر سورۃ الاعراف کے خاتمے پر پھر توجہ دلائی گئی ہے کہ: ﴿وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ﴾ ’’اور جب آپؐ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو یہ کہتے ہیں کہ آپ اسے کیوں نہیں چھانٹ ہی لاتے؟‘‘ —— اس جملے میں اعتراض اور الزام کے ساتھ ساتھ تمسخر و استہزاء بھی چھپا ہوا ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کے بارے میں سردارانِ قریش نے اپنے عوام کو اس پروپیگنڈے کے فریب میں مبتلا کر دیا تھا کہ یہ اِدھر اُدھر کی سنی سنائی باتیں ہیں جو کچھ عجمی لوگوں اور کچھ یہود و نصاریٰ کے علماء سے لے کر انہوں نے کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کے ذریعے ذرا خوشنما اور دلآویز ترتیب کے ساتھ پیش کر دی ہیں۔ تو گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ: ’’اے محمد (ﷺ) یہ کام تو آسان تھا جو تم نے کر لیا —— ذرا ایسے ہی کوئی ہماری پسند کا حسی معجزہ بھی کہیں چھانٹ کر لے آؤ تو بس پھر تم کامیاب ہو جاؤ گے اور ہمارے پاس تمہارے انکار کی کوئی معقول وجہ باقی نہ رہے گی۔ تو کیوں نہیں کر گزرتے ایسا معمولی سا کام!‘‘ —— جواباً یہاں بھی آپؐ سے وہی بات کہلوائی گئی جس کا ذکر اس سے قبل سورۂ بنی اسرائیل کے حوالے سے ہو چکا ہے کہ: ’’میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے!‘‘ یعنی معجزے دکھانا خدائی اختیار میں ہے اور میں نے خدائی کا

دعویٰ ہرگز نہیں کیا۔ میں تو نبوت و رسالت کے درپے بھی نہ تھا اور میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ امانت کا یہ بارِ گراں میرے کاندھے پر ڈال دیا جائے گا' تا آنکہ حکم ربانی آ پہنچا اور بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ (المزمل) نبوت کا یہ بارِ گراں مجھ پر ڈال دیا گیا ——— اب میں تو خود بھی اس وحی کا پابند ہوں جو مجھ پر نازل کی جا رہی ہے اور اس کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں ——— اس کے بعد مخالفین و معاندین سے صرفِ نظر فرماتے ہوئے آنحضور ﷺ کی جانب التفات فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کی عظمت بیان فرماتا ہے کہ اس کی آیات بینات ہی میں اصحابِ عقل و خرد کے لیے اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپؐ کی رسالت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں' طالبینِ ہدایت کو ان ہی کے ذریعے جملہ حقائق تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے' اور اہلِ ایمان کے حق میں تو یہ نعمتِ بے بہا ہیں' یعنی اس دنیا میں ذریعہ ہدایت اور آخرت میں موجبِ رحمت!!

آخر میں اہلِ ایمان کو حکم ہوا کہ اس قرآن کی قدر پہچانیں اور اس کا ظاہری و معنوی ہر طرح کا ادب ملحوظ رکھیں' جس کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ جب بھی کہیں اسے پڑھا جا رہا ہو تو بالکل ساکت و صامت ہو کر اس کی جانب متوجہ ہو جائیں اور پورے دھیان اور کامل توجہ کے ساتھ اسے گوشِ حقیقت نیوش سے سنیں ——— واقعہ یہ ہے کہ رحمت خداوندی تک رسائی کا اس سے زیادہ سہل اور یقینی راستہ اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قرآن حکیم کی قدر کرنے اور اس کے جملہ حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

(۴)

سورۃ الاعراف کی آخری دو آیات ۲۰۵ تا ۲۰۶ حسبِ ذیل ہیں:

﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۲۰۵ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَیُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ ۝۲۰۶ ﴾

''اور (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کو دل ہی دل میں بھی عاجزی اور خوف کے ساتھ یاد کرتے رہا کرو اور پست آواز سے بھی' صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی' اور غفلت کو قریب نہ پھٹکنے دو! بے شک تمہارے رب سے قرب رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی

کے گھمنڈ میں آ کر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور (ہمیشہ) اس کی تسبیح کرتے اور اس کے لیے سربسجود رہتے ہیں!''

ان الفاظِ مبارکہ پر سورۃ الاعراف کا اختتام ہو رہا ہے اور اکثر مکی سورتوں کے اسلوب کے مطابق یہاں بھی خصوصی التفات اور خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کی جانب' اور اس میں خصوصی تاکید وارد ہوئی ذکر الٰہی اور اس پر مداومت کی!

ویسے تو بندۂ مؤمن کی اصل دولت اور اس کا اصل سرمایۂ تسکین ہر حال میں ذکرِ الٰہی ہی ہے' جیسے کہ خود آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلَاةِ)) (سنن النسائی) ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے''۔ گویا بقول شخصے ؎

حاصلِ زندگی ہیں وہ لمحے جو تری یاد میں گزرتے ہیں!

لیکن خاص طور پر دعوت اِلی اللہ کی راہ کی مشکلات اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے راستے کے مصائب سے نبرد آزما اور عہدہ برآ ہونے کے لیے تو مؤمن کا واحد سہارا اللہ کی یاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ المزمل کے آغاز میں جہاں یہ خبر دی گئی کہ: ﴿ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝۵﴾ ''ہم آپؐ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں!'' وہیں اس راہ کے موانع و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے ضمن میں یہ ہدایتِ تامہ دے دی گئی کہ: ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا ۝۸﴾ (المزمل) ''اور اپنے رب کے نام کی مالا جپا کرو اور ہر طرف سے کٹ کر بس اُسی کے ہو کر رہ جاؤ!'' سورۂ الم نشرح میں فرمایا: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝۷ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝۸﴾ ''پس جب بھی دعوت و تبلیغ کی مصروفیتوں سے ذرا فراغت و فرصت ملے تو فوراً کمربستہ ہو جاؤ اور اپنے رب کی جناب میں متوجہ ہو جاؤ!'' یہ ہدایات تو بالکل ابتدائی دور میں دی گئیں' اس کے بعد جیسے جیسے تمسخر و استہزاء اور تشدد و ایذا میں اضافہ ہوتا چلا گیا' ذکرِ الٰہی کی تاکید اور اس پر مداومت کے حکم میں بھی شدت پیدا ہوتی چلی گئی' جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿ اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ﴾ (آیت ۴۵) ''اور پڑھا کرو جو وحی کیا گیا تمہاری جانب کتاب میں سے اور نماز قائم رکھو۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے۔ اور یقیناً ذکرِ الٰہی سب سے بڑی چیز ہے!''

سورۃ الاعراف جس زمانے میں نازل ہوئی وہ گویا کُفّارِ مکّہ کی مخالفت وعداوت کے عروج کا دور ہے جس میں سردارانِ قریش نبی اکرم ﷺ کے قتل کی قرارداد پر متفق ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس موقع پر پھر نہایت زوردار الفاظ میں اسی ذکرِ الٰہی کی تاکید فرمائی گئی —— اور یہاں اس ذکر کے بعد بعض آداب بھی تلقین فرما دیے گئے‘ جو حسبِ ذیل ہیں:

اوّلاً: یہ کہ یادِ الٰہی کا اصل محل قلب ہے۔ گویا اگر دل میں یاد ہو تو خواہ زبان نہ بھی حرکت کرے اور آواز نہ بھی پیدا ہو‘ ذکر کا مقصد حاصل ہو جائے گا‘ اور اس کے برعکس اگر دل غافل ہو تو خواہ زبان بھی حرکت کر رہی ہو اور آواز بھی زور شور سے پیدا ہو رہی ہو‘ یہ ذکر لاحاصل رہے گا۔ گویا اصل ذکر‘ ذکر قلبی و نفسی ہے‘ لہٰذا پہلی بات یہی ارشاد ہوئی کہ: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ﴾

ثانیاً: یہ کہ ذکر کرتے ہوئے بندے پر عاجزی اور فروتنی اور خوف وخشیت کی کیفیات بتمام و کمال طاری ہونی چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ اس ذکر کے لیے بمنزلۂ روح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بندے کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک‘ آقا و خداوند اور پروردگار و پالن ہار کے سامنے عجز و تذلل اور تواضع و انکسار کا اظہار کرتا رہے‘ اور اس کی ہر ہر حرکت سے یہ ظاہر ہو کہ وہ آقا نہیں غلام ہے اور مالک نہیں بندہ ہے۔ پھر جہاں خاص طور پر معاملہ آقا کے حضور میں پیشی کا ہو‘ جیسا کہ نماز یا ذکرِ الٰہی کی صورت میں ہوتا ہے‘ تو ایسے مواقع پر تو یہ کیفیات پوری شدت سے ظاہر ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً﴾۔ اس مثبت اسلوب کے ساتھ ساتھ اگلی آیت میں سلبی انداز میں بھی واضح فرما دیا گیا کہ: ’’یقیناً جو تیرے رب کے پاس ہیں!‘‘ یعنی ملائکہ مقربین ان پر اپنی تمام تر جلالت قدر اور علوِ منزلت کے باوجود ہمیشہ یہی تضرع و اخبات کی کیفیت طاری رہتی ہے اور انہیں کبھی کوئی تکبّر یا غرور و گھمنڈ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے رب کی عبادت سے روگردانی کریں‘ بلکہ وہ ہمیشہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تسبیح وتحمید اور تقدیس میں لگے رہتے ہیں‘ اور اپنے رب کے سامنے سربسجود رہتے ہیں۔ جیسے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آسمانوں پر کوئی ایک بالشت جگہ بھی ایسی خالی نہیں جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنے رب کے سامنے سجدے میں پیشانی ٹکائے ہوئے نہ ہو۔ واضح رہے کہ لفظ عبادت کا اصل لغوی مفہوم بھی اظہارِ عجز و تذلّل ہی ہے۔ چنانچہ مشہور امام لغت ابوحیان اندلسی کا قول ہے کہ: ’’اَلْعِبَادَةُ التذلّل ‘ قالَهُ الجَمهور ‘‘ (یعنی جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ عبادت تذلّل کو کہتے ہیں!)

ثالثاً: یہ کہ اگر ذکر قولاً کیا جائے تو یہ بھی زیادہ بلند آواز سے نہ ہو بلکہ: ’’دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ‘‘ کیا جائے‘ یعنی دبی زبان یا پست آواز سے۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمائی گئی کہ:

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۱۰﴾

’’اللہ سے دعا و مناجات میں نہ تو آواز کو زیادہ بلند کرو اور نہ ہی اسے بالکل پست کر لو بلکہ اس کے بین بین روش اختیار کرو!‘‘

ذکر میں زبان کو حرکت دینے اور کسی قدر آواز پیدا کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اعضاء و جوارح اور اس کے حواسِ ظاہری بھی اس بابرکت کام میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور بالخصوص وہ عوام الناس جو بقول علامہ اقبال مرحوم و مغفور ’’خوگرِ پیکرِ محسوس‘‘ ہوتے ہیں اور جن کے لیے بغیر کسی ظاہری اور محسوس طریقے کے صرف دل یا جی میں ذکر کرنا مشکل ہوتا ہے ان کو اس سے دلجمعی اور یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔ البتہ اس میں آواز کو زیادہ بلند کرنے سے اس لیے روک دیا گیا کہ ایک تو اس میں سوءِ ادب ہے کہ شاید‘ نعوذ باللہ من ذالک‘ اللہ کو پکارنے والا اسے بہرا سمجھ رہا ہے —— اور دوسرے اس میں ریاکاری اور ظاہرداری یعنی اصطلاحِ شرع میں ریا و سُمعہ کا امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے‘ جس سے عبادت سرے سے باطل ہو جاتی ہے اور اس کا سارا اجر و ثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

رابعاً: یہ کہ یہ ذکرِ الٰہی ﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ ہونا چاہیے —— ان الفاظِ مبارکہ کے معنیٰ و مراد میں دو احتمالات ہیں: ایک یہ کہ یہ بطور محاورتاً استعمال ہوئے ہوں یعنی صبح و شام‘ جس سے مراد ہوگی ہمیشگی اور مداومت‘ یعنی بندۂ مؤمن بالخصوص داعیٔ حق کا دل اللہ کی یاد سے ہر دم اور ہر لحظہ معمور رہنا چاہیے‘ اس لیے کہ اس معاملے میں وہ بات بالکل مبنی برحق ہے جو عارفِ حق نے فرمائی کہ: ’’یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد!‘‘ —— یعنی ذکرِ الٰہی وہ چیز ہے جس سے ایک لحظے کی غفلت بھی بسا اوقات سو سال کی مسافت کا فرق ڈال دیتی ہے! اس مفہوم کے اعتبار سے اگلے الفاظ: ﴿وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝﴾ اسی کی تاکید مزید اور وضاحت مزیدہ کے حامل قرار پائیں گے۔ یعنی اللہ کی یاد قلبِ مؤمن میں ہر دم تازہ رہنی چاہیے اور اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی غفلت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے‘ مبادا عین اسی لمحے شیطان وار کرے اور اس کا یہ وار کارگر ہو

جائے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطانِ لعین اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر جمائے رکھتا ہے اور پھونکیں مارتا رہتا ہے اِلّا یہ کہ دل میں یادِ الٰہی موجود ہو۔ جب تک بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے شیطان اس سے دور رہتا ہے اور جونہی وہ غافل ہوتا ہے یہ اپنی تھوتھنی کو پھر اس کے دل پر آ جماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان کی صفت خَنَّاس ہے، یعنی پیچھے ہٹ جانے والا اور پھر پلٹ کر حملہ کرنے والا!!

بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ کے الفاظ میں ایک دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ ان سے فی الواقع صبح و شام کی نمازیں ہی مراد ہوں۔ قرینہ اس کا یہ ہے کہ ''غُدُوّ'' واحد ہے اور صبح کی نماز بھی ایک ہی ہے یعنی صلوٰۃ الفجر اور ''اٰصال'' اصل کی جمع ہے اور اس سے مراد شام کی نمازیں ہیں، جو تعداد میں چار ہیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ حکمت اس کی یہ ہے کہ طلوعِ شمس سے لے کر بعد دوپہر تک کا وقت لوگوں کو اپنی معاشی دوڑ دھوپ کے لیے ایسا مل جائے جس میں کوئی وقفہ نہ ہو۔ اور سورج کے ڈھلنے کے آغاز سے لے کر رات کے تاریک ہو جانے تک کے وقت میں پے بہ پے نمازوں کے اوقات آ جائیں، جیسے کہ ہمارے یہاں بالخصوص سردی کے موسم میں ہوتا ہے، تب بھی روزانہ کے کام کاج میں زیادہ حرج واقع نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ ؕ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا ﴿۷۸﴾﴾

''نماز قائم رکھو سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کے تاریک ہو جانے تک اور خصوصی اہتمام کرو فجر کے وقت قراءتِ قرآن کا۔ یقیناً فجر کے وقت کی قراءتِ قرآن مشہود ہوتی ہے!''

اس سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ''ذکرِ الٰہی'' کے ضمن میں قرآن کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ جہاں دوسرے تمام طریقوں اور ذریعوں کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے، جیسے کہ ارشاد ہوا کہ: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِىۡ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''نماز کو قائم کرو میری یاد کے لیے''، گویا نماز کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے، وہاں قرآن خود مجسم ذکر ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر) ''یقیناً ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل فرمایا ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!'' اور: ﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ (النحل: ۴۴) ''اور نازل فرمایا ہم نے یہ ذکر (یعنی قرآن) آپ کی جانب تاکہ آپؐ واضح کریں لوگوں کے سامنے جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف!''

الغرض سورۃ الاعراف کے اختتام پر ایک جانب تو ذکرِ الٰہی اور اس کے دوام کی تاکید غایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ آ گئی اور ساتھ ہی اس کے آداب و اصول بھی نہایت اختصار لیکن حددرجہ جامعیت کے ساتھ بیان ہو گئے، فَلِلّٰهِ الۡحَمۡدُ وَالۡمِنَّةُ —— اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ذکر کی توفیق دے اور اپنی یاد اور دعا و مناجات کی لذت و حلاوت سے آشنا کرے، تاکہ ہم صبح و شام جی ہی جی میں بھی، اور پست آواز سے بھی، کامل الحاح و زاری، تضرع و اخبات اور خوف و خشیت کے ساتھ اسے پکارتے رہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربِّ العٰلمین ○

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

- ☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
- ☆ بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
- ☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
- ☆ تلاوتِ قرآن، دروسِ قرآن، دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
- ☆ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
- ☆ میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
- ☆ اردو اور انگریزی کتابیں
- ☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

دُعا

صاحب زادہ خورشید احمد گیلانیؒ

دُعا بظاہر ایک دینی اصطلاح ہے اور اہلِ دنیا اسے نیکوں‘ نمازیوں‘ صوفیوں اور مولویوں کا وظیفہ گردانتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ غریب‘ محتاج‘ سائل اور کمزور لوگوں کا نفسیاتی سہارا —— یہ بلاشبہ پاکبازوں اور صوفیوں کا وظیفہ ہے اور محتاج اور بے وسیلہ لوگوں کی روحانی ڈھارس‘ لیکن بات یہاں آ کر ختم نہیں ہو جاتی‘ بلکہ دعا وہ وظیفہ ہے جو بندے کو احساسِ بندگی دلاتا اور رحمتِ حق کو مہمیز دیتا ہے —— دعا نقطۂ اتّصال ہے‘ جو بندے کی تمنّا اور اللہ کی عطا کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے۔ دعا وہ حالت ہے جب بندہ اللہ سے سرگوشی کرتا ہے اور اس کی رحمت بڑی دیر تک کان لگائے رہتی ہے۔ بندہ جو باتیں کسی انسان سے نہیں کہہ پاتا وہ بے تکلّف اپنے مالک و مولا سے بیان کر دیتا ہے۔ بعض اوقات کوئی ضرورت مند‘ کوئی محتاج‘ کوئی کارگہ حیات میں بچھڑ جانے والا‘ کوئی غریب‘ کوئی مسکین اور کوئی سفید پوش اپنے جیسے یا اپنے سے بڑھ کر کسی دولت مند اور کسی خوش حال شخص سے اپنی ضرورت بیان کر بھی دے تو دونوں صورتوں میں اس کی عزّتِ نفس مجروح ہوتی ہے‘ خواہ اسے جھڑک یا ٹال دیا جائے یا اس کو عطا کر دیا جائے —— ٹالے جانے کی صورت میں تو وہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا اور عطا کیے جانے کی شکل میں وہ سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے‘ مگر بارگاہِ ایزدی سے نہ تو کبھی ذلت پڑتی ہے‘ نہ کسی کو جھڑک دیا جاتا ہے‘ اور حسبِ تمنّا عطا کر دینے پر بھی بندے کو پشیمان نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا دراصل مان بڑھایا جاتا ہے کہ بندہ اپنے رب پر مان نہ کرے تو کس پر کرے؟ اس کو عطائے ذاتِ لم یزل پر ناز نہ ہو تو کس پر ہو؟ اس کی محبت دربارِ خداوندی سے پوری نہ ہوگی تو اور کہاں ہوگی؟

اور جتنے بھی سہارے ہیں سبک کرتے ہیں
عزّتِ نفس بڑھاتا ہے سہارا تیرا!

بسا اوقات رشتہ دار ضروریات پوری کر دیتے ہیں‘ احباب آڑے وقت میں کام آ جاتے ہیں‘ محلہ دار ڈھال بن جاتے ہیں‘ دفتری رفقاء مدد کر دیتے ہیں‘ رحم کھانے والے بھی ہاتھ تھام لیتے ہیں‘ سخی لوگ ہاتھ کی میل سمجھ کر کچھ دے دیتے ہیں‘ خدا ترس بندے بھی ہاتھ بٹا دیتے ہیں۔ آخر اسباب کی دنیا ہے‘ کوئی نہ کوئی حیلہ بروئے کار آ جاتا ہے‘ مگر ان میں سے ہر ایک کبھی نہ کبھی عنوان بدل بدل کر احسان جتاتا اور اپنا آپ دکھاتا ہے۔ رہ گئی ذاتِ باری تعالیٰ‘ وہ دیتی بھی ہے اور بندے پر خوش بھی ہوتی ہے کہ اس نے مجھے پکارا‘ اس نے مجھے بلایا‘ اس نے مجھے یاد کیا‘ اس نے مجھ سے مانگا —— اس کے ہاں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

آتا ہے فقیروں پہ اسے پیار کچھ ایسا
خود بھیک دے اور خود کہے منگتے کا بھلا ہو!

اس مفہوم کی ایک حدیث ہے کہ ”اللہ اس بندے سے ناراض ہوتا ہے جو اس سے نہ مانگے“ یعنی لوگ مانگنے پر منہ بناتے اور اُکتاتے ہیں جب کہ خدا مانگنے پر خوش‘ دستِ سوال دراز کرنے پر مسرور اور دعا کرنے پر راضی ہوتا ہے —— کسی سائل و محتاج کے سوال اور اظہارِ مدعا پر وہ فرشتوں کی مجلس میں بندے کی عزتِ نفس کا مذاق نہیں اڑاتا‘ بلکہ انہیں گواہ بنا کر کہتا ہے:

”فرشتو! میرے بندے نے مجھ سے سوال کیا‘ میں اس سے بہت خوش ہوں‘ جاؤ اسے خوشخبری دے دو کہ جو کچھ اس نے مانگا‘ وہ بھی اسے دے دیا گیا اور جو وہ بھولے سے مانگ نہیں پایا‘ وہ بھی عطا کر دیا گیا۔“

ہر شخص کو یہ احساس ہے کہ دنیا میں کسی سے کچھ مانگنا کس قدر اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتا ہے‘ آدمی گلے تک زمین میں گڑ گڑ جاتا ہے‘ پیشانی پر پشیمانی کے کتنے بڑے بڑے گومڑ نکل آتے ہیں‘ زبان کس قدر ہکلاتی اور تھتھلاتی ہے‘ کانوں کی لویں شرم سے تپ جاتی ہیں‘ آنکھوں کی پتلیاں کس بے بسی سے گردش کرتی دکھائی دیتی ہیں‘ سانس کے ساتھ آواز بھی بے ترتیب ہو جاتی ہے‘ دل کی دھک دھک سے سینہ پھٹنے کو آ جاتا ہے‘ ماتھے کا عرقِ انفعال ڈوبنے کو کافی ہوتا ہے‘ بولتے ہوئے ہونٹوں کا کھنچنا اور بھنچنا قیامت سے کم نہیں ہوتا‘ خدا کسی کو کسی کا محتاج نہ کرے۔

شالا مسافر کوئی نہ تھیوے ککھ جنھاں تھیں بھارے ہُو!

لیکن وہی محتاج انسان جب خدمتِ الٰہی میں حاضر ہوتا ہے‘ کھل کر روتا ہے‘ مگر شرمندہ نہیں

ہوتا' الٹا دل کا غبار دھل جاتا ہے' گڑگڑاتا ہے مگر ہچکچاتا نہیں' بندہ دھاڑیں مار کر روتا ہے مگر مہربان رب اس کا داغِ ندامت ہمیشہ کے لیے دھو دیتا ہے۔ وہ کہنیاں زمین پر رگڑتا ہے مگر خدا اس کا مان رکھتا ہے' وہ عاجزی سے گال زمین پر ٹیکتا ہے' غفور و رحیم خدا اسے حقارت سے نہیں' بہت پیار سے دیکھتا ہے۔ وہ جس قدر بے بسی سے ہاتھ پھیلاتا ہے' رؤف و رحیم بڑی تیزی سے اس کے قریب آجاتا ہے۔ اس کی جناب سے ملتا تو ہے ہی' پر مرحلۂ دعا اس عطا سے کہیں بڑھ کر کیف آگیں اور روح افزا ہوتا ہے۔

کیسے مزے کے دن تھے کہ راتوں کو صبح تک
میں تھا ' تیری جناب تھی ' دستِ سوال تھا!

بعض اوقات اللہ تعالیٰ بندے کا ذوقِ طلب بڑھانے اور آتشِ شوق بھڑکانے کے لیے دعا کی قبولیت میں تاخیر کر دیتا ہے' یہ بندے کے لیے تعزیر نہیں' اس کی دعا کو اکسیر بنانے کے لیے ہوتی ہے —— مالک الملک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ بندہ واقعی مجھے سب کچھ سمجھتا ہے یا ابھی کسی اور سے بھی آس لگائے بیٹھا ہے —— کیا محض میری رحمت کو ٹٹولنے آیا ہے؟

ایک فرمانِ رسول ﷺ کے مطابق تین بار تو اللہ تعالیٰ اپنا رخِ رحمت اِدھر اُدھر کرتا ہے' مگر چوتھی بار اس کا کرم چھلک پڑتا ہے اور بندے کی کشتِ زارِ آرزو کو سیراب کر دیتا ہے۔ بعض بندے بڑے عجلت پسند اور تھڑدِلے ہوتے ہیں' اپنی اس ادا سے وہ رحمتِ حق کو تو نہیں' البتہ خود کو آزمائش میں ڈال لیتے ہیں' ورنہ اللہ تو سیاہ راتوں میں چکنے اور سیاہ پتھر میں بسیرا کرنے والے حقیر کیڑے کی سنتا رہتا ہے' بھلا وہ اشرف المخلوقات انسان کی کیوں نہ سنے؟ انسان خواہ بدکار ہو یا نیکوکار' تہجد گزار ہو یا ناہنجار' پرہیزگار ہو یا رسوائے روزگار' خوش اطوار ہو یا بدکردار' دینے والا منہ دیکھ کر نہیں دیتا' اپنی شانِ کرم دیکھتا ہے —— اسی لیے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں فرماتے ہیں:

''الٰہی! تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیرے شایانِ شان ہے' وہ نہ کر جس کا میں حق دار ہوں۔''

مانگنے کی یہ ادا ہو تو دعا اشارۂ ابرو سے آگے نہیں بڑھ پاتی' اس سے پہلے قبول ہو جاتی ہے۔ بندے پر لازم ہے کہ وہ جلدی نہ دکھائے' اپنی دردمندی ظاہر کرے' وہ عجلت افروزی سے زیادہ دل سوزی پر زور دے' وہ آشفتہ سر نہ بنے' صحیح معنوں میں گداگر بن کر رہے' وہ ساعتیں شمار نہ

کرے' ابرِ کرم کے برسنے کا انتظار کرے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکایت کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ کسی شخص کو شوق چڑھا کہ وہ ولی اور مجذوب بن کر مرجع خلائق کہلائے اور یہ سب کچھ چند دنوں میں ہو جائے —— ڈنڈا ڈیرا اٹھایا اور پہاڑ کی کھوہ کو چل دیا' دو چار روز عالم استغراق میں رہا' کچھ وظیفہ کیا' چند دعائیں پڑھیں اور بیٹھ گیا فتوحات کے انتظار میں —— بھلا ہفتے بھر میں کیا ہونا تھا؟ اس کا تو خیال تھا کہ بس کوئی دن ہوگا' لوگ کھنچے چلے آئیں گے' ڈالیاں دوڑتی اور قابیں اچھلتی آئیں گی' دودھ کے مٹکے پہنچ جائیں گے اور آبِ یخ کی صراحیاں لبالب دھری ہوں گی —— بھلا کبھی فقر بھی اس مکر سے ہاتھ آیا ہے؟ اور کوئی فقیر اس تدبیر سے بنا ہے؟ وہ شخص طالبِ جاہ تھا' بھوک پیاس سے نباہ نہ کر سکا' وہ خواستگارِ آسائش تھا' آزمائش میں نہ پڑ سکا' فوراً اٹھا' پوستین گلے میں حائل کی' ہاتھ میں کشکول تھاما اور قریب کی بستی میں جا نکلا' پہلے ہی در پر صدا دی تھی کہ ایک خونخوار کُتّے سے پالا پڑ گیا۔ یہ بدکتا جا رہا تھا اور کُتّا لپکتا آ رہا تھا۔ یہ پیچھے کو رکتا' کتا آگے کو مچلتا' تنگ آ کر نام نہاد فقیر نے کتے سے پوچھا کہ میں بے نوا بھکاری ہوں' تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ نہ تمہیں جھڑکا' نہ ڈھیلا مارا' نہ ڈانگ اٹھائی' تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ شیخ سعدیؒ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر قدرت نے کتے کو قوتِ گویائی بخشی اور وہ بولا: ارے کم ظرف! تم تو گئے تھے آستانۂ رب پر بیٹھنے' اس سے ملنے اور اس سے مانگنے' یہ کیا کہ چار دن میں جی بھر گیا اور آ گئے ہو غیر اللہ کے در پر —— مجھے دیکھو' کئی سالوں سے اپنے مالک کی ڈیوڑھی میں بندھا ہوں' کچھ ڈال دیتا ہے تو کھا لیتا ہوں' نہیں ڈالتا تو اسے بھونکتا نہیں ہوں' کئی دن فاقے بھی کاٹتا ہوں' مگر مالک کا در چھوڑ کر کسی دوسرے کی چوپڑی روٹی پر طمع کی نگاہ نہیں ڈالی' اپنے مالک کی چھچھوڑی ہڈی پر گزارا کیا ہے' جا یہاں سے چلا جا' ورنہ تجھے پھاڑ کھاؤں گا۔ تب اس ملمع ساز کی آنکھ کھلی اور چلتا بنا۔

رب کے حضور حاجات کا پیش کرنا یا دعا مانگنا کمیت نہیں' ایک کیفیت ہے' مانگنے کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی عربی ادب کا لبید و جاہز ہو' فارسی لٹریچر کا رومی و سعدی ہو' انگریزی ادبیات کا ملٹن اور آسکر وائلڈ ہو' اردو کا غالب و ابوالکلام ہو' نہیں! کیفیت ایک نابلد محض کی بھی ہو سکتی ہے۔ گونگا بھی اپنے انداز میں ربِّ کریم کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکتا ہے' ہکلانے والا شخص بھی اپنا دل کھول کر رکھ سکتا ہے —— کج مج بیان بھی سادگی سے اپنا مدعا پیش کر سکتا ہے —— رب کی

رحمت محض رازی وغزالی کے لیے نہیں اور نہ ہی اس پر جنید و بایزید کا اجارہ ہے‘ یہ لوگ ہزار مقبولِ بارگاہِ الٰہی سہی‘ اگر خدا صرف ان کی سنتا رہا تو ہم جیسے خاطی و عاصی کس در پر جائیں گے؟ جب کہ مریض سب سے زیادہ حاذق حکیم کی طرف لپکتا ہے اور طبیب کا سامانِ طب مریض کے لیے ہوتا ہے ـــــ سخی کا دروازہ خوش حالوں کے لیے نہیں‘ ہمیشہ بدحالوں کے لیے کھلتا ہے ـــــ ماں کا دریائے شفقت ہنستے کھیلتے بچے کے لیے نہیں‘ روتے‘ بلبلاتے بچے کے لیے جوش مارتا ہے۔ جس طرح ماں کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کے بچے کی جائے پناہ اس کی گود ہے‘ اس کی شفقت اس کا سینہ ہے اور اس کا واحد سہارا اس کی بانہیں ہیں‘ چنانچہ ماں بھی بچے کے لیے وقف ہوتی ہے اور بچہ بھی دائیں بائیں نہیں جھانکتا‘ لپک کر سیدھا ماں کی جھولی میں آ گرتا ہے ـــــ یہی کیفیت اگر بندے کی ہو‘ رب کو یہ یقین ہو کہ میرے بندے کا اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں اور بندے کا بھی پختہ اعتقاد ہو کہ رب کے علاوہ کوئی لائقِ بھروسا نہیں‘ تو پھر وہ کچھ رونما ہوتا ہے‘ جسے قرآن معجزہ کہتا ہے۔

ایک بچہ جب اپنے باپ سے فرمائش کرتا ہے کہ وہ سکول جاتے ہوئے تھک جاتا ہے‘ گرمی اسے ستاتی ہے‘ دوست اسے طعنے دیتے ہیں اور یہ جانے بغیر کہ اس کے باپ کے پاس وسائل ہیں یا نہیں‘ سائیکل کی مانگ کر بیٹھتا ہے۔ پہلے دن باپ اسے نرمی سے سمجھاتا ہے کہ بیٹا! پیسے ہوتے تو ضرور سائیکل لے کر دیتا۔ دوسرے دن کی طلب پر ذرا جھڑکنے کے انداز میں کہتا ہے: جان من! مجھے علم ہے‘ تمہیں تکلیف ہوتی ہے‘ مگر میری تکلیف اور مجبوری کا بھی خیال کرو۔ اس سے اگلے دن اکتاہٹ کے انداز میں باپ ڈانٹتے ہوئے بتاتا ہے کہ کیا تمہاری سائیکل کے لیے کسی کی جیب کاٹوں؟ کسی کی دیوار پھلانگوں؟ کسی سے بھیک مانگوں؟ لیکن جب بچہ بول اٹھتا ہے: ابا جان! میری فرمائش بے جا سہی اور آپ کی مشکل بجا سہی‘ مگر کیا کروں‘ مجھے جب بھی کچھ کہنا ہے‘ آپ سے کہنا ہے اور جو مانگنا ہے آپ سے مانگنا ہے‘ کوئی اور باپ کہاں سے لاؤں کہ اس سے فرمائش کروں! یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں باپ اپنا دل سینے سے باہر ابلتا ہوا محسوس کرتا ہے‘ پھر وہ اپنی روزمرہ ضروریات کی پروا نہ کرتے ہوئے بیٹے کی دل جوئی کا سامان کرتا ہے ـــــ یہی کیفیت دراصل بندے کے لیے مطلوب ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی عاجزی‘ مسکینی‘ بے بسی‘ بندگی‘ حاجت طلبی‘ اشک ریزی اور خود سپردگی کے باعث ایسے موڑ پر لے آئے تو پھر رحمتِ خداوندی چھلک چھلک پڑتی ہے اور مہک مہک اٹھتی ہے۔ بندہ پہلے اظہارِ بندگی تو کرے پھر شانِ خداوندی

کا نظارہ ہو جاتا ہے۔

یہ کیا کہ جھٹ مانگا اور پٹ انتظار میں بیٹھ گیا‘ دعا جب تک کیفیت نہ بنے‘ لذت کے سانچے اور تمنّا کے اس پیکر میں نہ ڈھلے‘ پھر وہ دعا نہ ہوئی‘ محض مدعا بن گیا اور وہ بھی بے رنگ اور بے کیف! بندہ جب اپنے ہاتھوں کو مجسّم سوال بنا لیتا ہے اور دامن کو کشکول میں بدل دیتا ہے تو پھر ایک آہِ سرد اور ایک قطرۂ اشکِ گرم اس کے سب سے بڑے سفارشی اور قبولیت کے ضامن بن جاتے ہیں۔ دعا لفظوں کے تکرار کا نہیں‘ بندگی کے اظہار کا نام ہے۔ جب انسان یہ کہنے پر آ جائے‘ تو پھر خدا (اپنی شان کے لائق) عرشِ علیٰ سے اتر کر آسمانِ دنیا پر اترتا اور اپنے بندے کی دعا سنتا ہے ـــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ کس قدر وجد انگیز‘ ذوق آفریں اور روح پرور ہیں کہ:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِمَنْ لَّا یَمْلِکُ اِلَّا الدُّعَاءَ

''اے اللہ! اس شخص کو بخش دے‘ جس کے پاس دعا کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں!''

پیارے قارئین! خود ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے بتائیے کہ اللہ کو ماننے اور اس کی توجہ پانے کے لیے اس سے بہتر ذریعۂ اظہار کیا ہو سکتا ہے‘ جو پیرایہ بابِ مدینۃ العلم نے اختیار کیا ہے۔

بندہ مال و زر پر اترائے‘ خانوادہ و خاندان کا رعب جمائے‘ عہدہ و منصب کی جھلک دکھائے‘ قبیلہ و برادری کا حوالہ سنائے اور اپنے نوافل و اذکار پر سینہ پھلائے اور پھر کہے‘ مولا! میری بھی سن ـــــ یہ عرض گزاری تو نہ ہوئی‘ دنیاداری ہوئی ـــــ اللہ کی منشاء یہ ہے کہ میرے بندے! تو میرے لیے سب رشتے توڑ کر آ‘ ساری دنیا تیرے ساتھ نہ جوڑ دوں تو پھر کہنا ـــــ تو کاسۂ دل ہر تمنا سے خالی کر کے آ‘ تیرے دل کو شاہ و والی نہ بنا دوں تو پھر کہنا ـــــ تو اپنی گردن نیچی کر کے آ‘ تیری ٹوپی جہاں بھر میں اونچی نہ کر دوں تو پھر کہنا ـــــ تو خواہشوں کے آنگن میں جھاڑو پھیر کے آ‘ میں بے نیازی کا چاند نہ اتار دوں تو پھر کہنا ـــــ تو ایک بار پلکیں بھگو کے آ‘ تیرے سارے دھونے نہ دھو دوں تو پھر کہنا۔ تو رشتہ و پیوند کو بھول کے آ‘ میں تجھے کونین میں ارجمند نہ کروں تو پھر کہنا ـــــ اور تو ایک بار صرف میرا بن کر آ‘ راحت و عظمتِ دارین تیرے نام نہ کر دوں تو پھر کہنا۔

رحمتِ رب کو پیسہ یا حوالہ درکار نہیں‘ بس ایک حیلہ مطلوب ہوتا ہے‘ اس لیے جہاں دعا کا ساتھ لفظ چھوڑ جاتے ہیں‘ جملے پیچھے رہ جاتے ہیں اور حرف جواب دے جاتے ہیں‘ وہاں کوئی حیلہ کام آ جاتا ہے‘ خواہ وہ دل کی تیز دھڑکن ہو‘ جسم کی کپکپی ہو‘ روح کی بے قراری ہو‘ آنکھوں کی

اشک باری ہو‘ دامن کا بے ساختہ پھیلاؤ ہو‘ ہاتھوں کا گدایانہ ارتعاش ہو‘ لہجے کا اضطراب ہو — اور کچھ بھی میسر نہ ہو تو گناہوں کا اعتراف قبولیتِ دعا کا زینہ بن جاتا ہے — بندہ بے صبرا نہ ہو‘ لمحوں میں قطعِ منازل کا اسے لپکا نہ ہو‘ ذرا انتظار کا آشنا ہو‘ پھر دیکھے کہ عرش اور فرش کا فاصلہ کیسے گھٹتا ہے‘ افلاک اور خاک کا کیسے ملاپ ہوتا ہے اور آقا و بندہ کیسے ہم کلام ہوتے ہیں؟

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو کچھ کرتے‘ کماتے ہیں‘ سب کچھ بچوں کے لیے ہوتا ہے‘ ان کی سہولت‘ ان کی خاطر داری اور ان کے مستقبل کے لیے ہم گھر میں مٹھائی اور پھلوں کا ٹوکرا لے آتے ہیں — بچوں کے لیے لاتے ہیں‘ مگر جب مانگتے ہیں تو سب کچھ انہیں نہیں دے دیتے‘ اس لیے نہیں کہ ان کے لیے نہیں لائے‘ بلکہ ان کے لیے جتنا ضروری اور مناسب ہے‘ وہ دیتے ہیں‘ جیب میں ہزاروں روپے ہوتے ہیں‘ لیکن بچوں کو خرچی کے لیے پانچ دس روپے ملتے ہیں‘ کیوں؟ کیا یہ سب کچھ بچوں کے لیے نہیں؟ بلاشبہہ ان کے لیے ہے‘ لیکن دیا اتنا جائے گا‘ جتنا ان کے لیے موزوں ہے — اسی طرح بلاتشبیہ و مثال‘ جو کچھ کائنات میں ہے‘ سب کچھ بندوں کے لیے ہے‘ اللہ نے یہ سب کچھ اپنی سہولت کے لیے نہیں جوڑ رکھا‘ انواع و امتاع کے کھانے‘ شیریں اور یخ پانی‘ متنوع ملبوسات‘ نرم بستر‘ اونچے بنگلے‘ میٹھی نیند‘ ذائقے دار پھل‘ نظر نواز مناظر‘ جنت نظیر باغات‘ گنگناتی آبشاریں‘ ہفت رنگ قوسِ قزح‘ کاروبار‘ تجارت‘ پیسہ دولت‘ برادری‘ منصب‘ عہدہ‘ تاج و کلاہ‘ لشکر و سپاہ‘ سریر و تخت‘ یہ سب چیزیں بندوں کے لیے ہیں‘ اللہ ان سب سے بے نیاز ہے‘ بندہ ان میں سے کچھ بھی مانگے تو ضروری نہیں‘ ہر چیز فی الفور مل جائے‘ بندوں کے لیے جو ضروری ہے‘ وہی دیا جائے گا — جس نے یہ حکمتِ ربانی پالی‘ گویا اس نے جیتے جی اپنی زندگی جنّت بنالی — قرآن مجید میں ہے:

> ’’ہوسکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو‘ اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘ (البقرۃ:۲۱۶)

یہ فلسفہ انسان کو وہ شان عطا کر دیتا ہے کہ پھر:

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی!

والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ خدا دینے پر آئے تو اس نے بندوں کو کیا نہیں دیا؟ اور کیا نہیں

دے سکتا؟ فرعون کو چار سو سال کی عمر بھی دی اور بادشاہت بھی‘ قارون کو دولت بھی دی اور رعونت بھی‘ سکندر کے قدموں میں تین چوتھائی دنیا ڈال دی‘ قیصر کو روم جیسی سلطنت بخش دی اور کسریٰ کو تاجِ ایران عطا کر دیا — کیا یہ باتیں ان کے حق میں گئیں؟ نہیں‘ ان کے مقابلے میں انبیاء کرام علیہم السلام دکھوں میں گھرے رہے — حضرت نوح علیہ السلام کو عمر بھر قوم کی مزاحمت کا سامنا رہا‘ حضرت لوط علیہ السلام اپنی بیوی کے ہاتھوں تنگ رہے‘ حضرت یوسف علیہ السلام کی سر بازار بولی لگی‘ حضرت یعقوب علیہ السلام ہجرِ یوسف میں آنکھوں کا نور کھو بیٹھے‘ حضرت زکریا علیہ السلام آرے کی زد میں آئے۔ ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سب سے پیارے انسان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف اور صحنِ کعبہ میں لہولہان ہوئے‘ تین سال شعبِ ابی طالب میں محصور رہے‘ تین سو میل سنگلاخ پہاڑیوں کا سفر کیا‘ جب مکہ سے مدینہ کو ہجرت ہوئی — نواسۂ رسول امام حسین رضی اللہ عنہ کو میدانِ کربلا میں حرفِ حق برملا کہنے پر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا — کیا یہ لوگ گھاٹے میں رہے؟ ہرگز نہیں! یہ لوگ دراصل رازِ الٰہی پانے والے لوگ ہیں‘ تبھی تو اپنی مراد پا گئے۔

دعا در حقیقت رازِ الٰہی پانے کی تمنّا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا‘ اس پر کشاد و فلاح کے سارے دروازے کھل گئے۔ وہ شخص راز پا گیا جسے معلوم ہوا کہ میں کچھ نہیں‘ سب کچھ میرا پروردگار ہے‘ پھر سب کچھ اسی کا ہو جاتا ہے‘ ارض بھی‘ سماء بھی‘ بندے بھی اور خدا بھی۔

دعا یہی سلیقہ سکھاتی ہے۔ آیئے! ہم سب اللہ کے حضور التجا کریں: بارِ الٰہا! ہم بھی تیرے‘ یہ وسائلِ رزق بھی تیرے‘ یہ ذرائعِ علم بھی تیرے‘ یہ کیفیاتِ قلب و دماغ بھی تیری اور یہ ملک بھی تیرے نام کا صدقہ ہے۔ تُو ہمیں اپنا بنالے‘ کائنات کو ہمارے لیے موم کر دے‘ وسائلِ رزق کو سب کے لیے عام کر دے‘ ذرائعِ علم سے ہر ایک کو فیض پہنچا اور اس ملک کی لاج اپنے محبوب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے رکھ لے۔ اسے کسی کا محتاج نہ بنا‘ اگر اس کو وجود بخشا ہے تو اسے شناخت بھی عطا فرما — آمین!

تشنہ لب چڑیا کے منہ میں گر نمی آ جائے گی
تیرے دریائے کرم میں کیا کمی آ جائے گی؟

سلسلہ وار دروسِ قرآن (۲۱)

شہادت علی النّاس

(سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں)

شجاع الدین شیخ ☆

آج ہم سورۃ الحج کے آخری رکوع کی روشنی میں ''شہادت علی الناس'' کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔ سب سے پہلے ان آیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ آیات ۷۳ تا ۷۶ میں کل نوعِ انسانی کے لیے دعوتِ ایمان ہے' بایں طور کہ آیت ۷۳ میں توحید باری تعالیٰ' آیت ۷۴ میں رسالت اور آیت ۷۵ میں آخرت کا بیان ہے۔ آیات ۷۷ اور ۷۸ میں اہلِ ایمان کے لیے دعوتِ عمل اور شہادت علی الناس کا تذکرہ ہے۔

معبودانِ باطلہ کی بے بسی اور اعلیٰ نصب العین

آیت ۷۳ میں ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝﴾

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی' پس اسے غور سے سنو۔ بیشک وہ ہستیاں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ہرگز نہیں بنا سکتیں ایک مکھی' اگرچہ وہ سب اس کے لیے جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ ہستیاں اسے چھڑا نہیں سکتیں۔ لاچار ہے طالب (عابد) اور مطلوب (معبود)۔''

آیت زیر مطالعہ میں بت پرستی کرنے والے مشرکین کے بُرے اور غلط عقیدوں کا رد کیا جا رہا ہے'

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت' تنظیم اسلامی

تاہم کچھ ذیلی باتیں بھی اس آیت کے ضمن میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جن بتوں یا معبودوں کو اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے' ان کی بے بسی کا بیان ہے اور دوسرا یہ کہ مطلوب اگر کم تر ہو تو طالب بھی کم تر ہوتا ہے۔ یہ حکمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے کہ انسان کا ہدف اگر ہلکا ہو تو اس کا طرزِ عمل بھی ہلکا ہوگا۔

قرآن حکیم ہمارے سامنے سادہ ترین پیغام رکھتا ہے' لیکن اس میں حکمت کی باتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔ قرآن مجید اللہ ربّ العزت کا کلام ہے جس میں حکمت کے حوالے سے تسکین کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ قیامت تک اس کی حکمت کے خزانے کھلتے چلے جائیں گے اور ہر انسان اپنی ذہنی استعداد اور اپنے ظرف کے مطابق اس سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر رفیع الدین بہت بڑے صاحبِ علم گزرے ہیں' انہوں نے اقبال کے کلام کی بہت خوبصورت شرح کی اور اسلامی تعلیمات کے حوالے سے فلسفیانہ سطح پر بہت قیمتی باتیں انہوں نے پیش کی ہیں۔ اس مقام کے حوالے سے بھی بہت خوبصورت وضاحت اور ایک علمی خزانے کا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انسان کہلانے کا حق دار وہی ہے جس کا حیوانی تقاضوں سے بلند تر کوئی مقصد' مطلوب یا نصب العین ہو۔ نصب العین اگر پست ہو تو اس کے حصول کی سعی و جُہد کے نتیجے میں ایک پست سیرت و کردار وجود میں آتا ہے۔ جس کا نصب العین محض اپنی ذات ہو تو ایسا شخص خود غرض ہوگا۔ جس کا نصب العین اپنی قوم' برادری یا وطن ہو تو وہ پہلے شخص سے بہتر ہوگا۔ جس کا نصب العین انسان دوستی ہو وہ نسبتاً زیادہ فراخ دل ہوگا' جبکہ اعلیٰ ترین نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے۔ جس شخص کی رسائی یہاں تک ہو جائے تو ایسا انسان صرف انسانیت سے نہیں' جملہ مخلوقات سے محبت کرتا ہے۔

انسان کو اپنی زندگی کسی گھٹیا اور پست نصب العین کے لیے برباد نہیں کرنی چاہیے۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے: never settle for less اور میں کہا کرتا ہوں: rather go for the best۔ اس حوالے سے اعلیٰ ترین نمونہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ کا آتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے یہ بات طے کر دی: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) ''یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا طرزِ عمل سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ ہی

کے لیے محنت و کوشش ہے۔ وہاں جانوروں کے حقوق بھی مل جائیں گے۔ ایک کُتّے کو پانی پلانے پر ایک شخص کو مغفرت کی بشارت دی گئی اور ایک عورت نے بلّی کو باندھ کر رکھا اور وہ مر گئی تو اسے میں نے دوزخ میں دیکھا ہے۔ یہ اعلیٰ ترین اقوال اور کردار اس وقت سامنے آئے جب رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر اللہ ہی کو راضی کرنا تھا جو اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔ چنانچہ ایمان والوں کے بارے میں سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵) ''اور جو ایمان لائے وہ اللہ کی محبت میں بہت پکے ہوتے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے اور اس کی رضا جوئی کو اپنا نصب العین بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

شرک کی بنیادی وجہ: معرفتِ الٰہی کا فقدان

آیت ۷۴ میں توحید کے حوالے سے ہمارے سامنے ایک اہم نکتہ آ رہا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۷۴﴾ ''انہوں نے اللہ کو پہچانا نہیں جیسا کہ اس کو پہچاننے کا حق تھا' بیشک اللہ قوت والا' زبردست ہے''۔ شرک کی بنیادی وجہ معرفتِ الٰہی کا فقدان ہے۔ اللہ ربّ العزت کو عام دنیوی بادشاہوں پر قیاس کر کے مختلف عقائد اور تصورات گھڑ لیے گئے ہیں۔ عام دنیوی قاعدہ یہ ہے کہ شہزادوں کو خوش کر دیا جائے تو بادشاہ سلامت خوش ہو جائیں گے' لہٰذا کچھ نہ کچھ تعلقات شہزادوں سے رکھنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر کسی بڑے افسر تک رسائی درکار ہو تو نیچے والوں کی مٹھیاں گرم کرنے سے بات اوپر تک پہنچ سکتی ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تک رسائی کے لیے کسی درمیان کے کردار کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ اس کو براہِ راست پکارا جا سکتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (آیت ۱۸۶) ''(اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (آپ بتا دیں کہ) بیشک میں قریب ہوں' اور جب بھی پکارنے والا مجھے پکارے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں۔''

شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسانوں کی اکثریت نے اللہ ربّ العزت کے بجائے دولت' شہرت' اقتدار' قوم یا وطن کو مطلوب بنا لیا۔ کہیں دولت کی لکشمی دیوی کی پوجا ہوتی ہے' دولت کا بُت بنایا جاتا ہے اور اس کے لیے حلال و حرام کی تمیز کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ صحیح بخاری

میں روایت ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) ''ہلاک ہو گیا درہم و دینار کا بندہ''۔ کوئی شہرت کے بت کا پجاری ہے تو کوئی اقتدار کی ہوس کا پرستار' جس کی خاطر اصولوں کو پامال اور ایمان کا سودا کر لیا جاتا ہے۔ اور کبھی وطن کی جے کے نعرے لگائے جاتے ہیں' جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

ان چکروں میں پڑ کر اور معبودِ حقیقی کو بھلا کر شرکیہ رویے اختیار کیے جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نہ ہونا ہے۔ اس کی بنیاد پر انسان کسی کم تر شے پر اپنے آپ کو مطمئن کر کے اسی کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے جال میں پھنس کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتا ہے۔

آیت ۷۵ میں ارشاد ہوا: ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝۷۵﴾ ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول' بیشک اللہ سننے والا' دیکھنے والا ہے''۔ رسول کے معنی پیغام لانے والا ہے اور رسول بننے کی سعادت محنت سے نہیں' بلکہ اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ سمیع اور بصیر ہے۔ اس کے برعکس انسانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی بات سننے کا تحمل کر سکیں یا اللہ کو دیکھ سکیں۔ انسانوں تک اپنی ہدایت پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ رسالت کو جاری فرمایا جو دو کڑیوں پر مشتمل ہے یعنی رسولِ ملک اور رسول بشر۔ اللہ کا پیغام فرشتوں میں سے رسول' انسانوں میں سے رسول کو پہنچاتے ہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد تیسری کڑی اُمّتِ مُسلمہ ہے جس پر بعد میں بات ہو گی۔

آیت ۷۶ میں ارشاد ہوا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۷۶﴾ ''وہ (اللہ) بخوبی جانتا ہے جو اُن کے سامنے ہے اور جو اُن کے پیچھے ہے' اور سب معاملات اسی کے حضور پیش کیے جاتے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود جانتا ہے کہ لوگ کیا اعمال آگے بھیج رہے ہیں اور اپنے اعمال کے کون سے اثرات وہ پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ صدقۂ جاریہ کا مستقل اجر ملتا رہتا ہے اور گناہوں کی نحوست بھی کھاتے میں جاری رہتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسان کی ترجیحات میں آخرت کی تیاری مقدم ہے یا مؤخر؟ پھر یہ کہ روزِ قیامت فیصلہ کن اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہو گا۔

دینِ اسلام کے عملی تقاضے

آیت ۷۷ اور ۷۸ میں بڑی جامعیت اور حکیمانہ تدریج کے ساتھ اہلِ ایمان کو عمل کی دعوت دی گئی ہے۔ ان آیات کا سورۃ العصر میں بیان شدہ شرائطِ نجات کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں۔ ایمان کا تذکرہ اہل ایمان سے خطاب میں ہے۔ عمل صالح کی وضاحت ''رکوع کرو' سجدہ کرو' اپنے رب کی عبادت کرو اور خیر کے کام کرو'' کے الفاظ سے کی گئی ہے۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے لیے جہاد کی اصطلاح ہے۔ سورۃ العصر میں خسارے سے بچنے کا ذکر تھا تو یہاں کامیابی کی نوید ہے۔

آیت ۷۷ میں ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۷۷﴾﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو' رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔ اس آیت میں دین کے تین عملی تقاضے بیان کیے گئے ہیں۔ اول ارکانِ اسلام کی ادائیگی' دوم عبادتِ رب اور سوم افعالِ خیر۔

ارکانِ اسلام کی ادائیگی: اس آیت میں ''رکوع کرو اور سجدہ کرو'' سے مراد نماز کی ادائیگی ہے۔ قرآن حکیم میں اکثر ارکانِ نماز کا ذکر کر کے نماز مراد لی جاتی ہے۔ جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا گیا: ﴿قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۲﴾﴾ ''رات کو قیام کیجیے مگر تھوڑی رات''۔ یہاں کھڑے رہنے سے مراد نماز ادا کرنا ہے۔ نماز تمام ارکانِ اسلام کی نمائندہ ہے۔ گویا نماز سے مراد ہے کہ تمام ارکانِ اسلام ادا کرو۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے۔

عبادتِ ربّ: اگلی بات عبادتِ رب کے حوالے سے ہے۔ عبادتِ ربّ کو انسانوں اور جنّوں کی تخلیق کا مقصد قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''میں نے جنّوں اور انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں''۔ شیخ سعدی نے اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں بیان کیا ہے:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

''عبادتِ رب'' سے مراد ہے زندگی کے ہر گوشے میں دلی آمادگی کے ساتھ اپنے رب کی کُلّی اطاعت کرنا' جب کہ ارکانِ اسلام ''عبادات'' ہیں جو انسان کو پوری زندگی میں اللہ کی عبادت کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس تقاضے پر زندگی کی آخری سانس تک عمل کرنے کی توفیق

عطا فرمائے۔

افعالِ خیر: اس آیت میں تیسرا تقاضا افعالِ خیر کا ہے کہ انسانیت کی خدمت کے لیے بھلائی کے کام کرو۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ملاحظہ ہو: ((خَیْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ)) (صحیح الجامع الصغیر' للالبانی) ''لوگوں میں بہترین وہ ہے جو لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے''۔ خیر اور بھلائی کے کاموں کے دو درجے ہیں' دنیوی اور اُخروی۔ دنیوی خدمتِ خلق یعنی بھوکوں کو کھانا کھلانا' ضرورت مندوں کا تن ڈھانپنا' بیماروں کی عیادت کرنا وغیرہ۔ دنیا میں اعلیٰ ترین خدمت خلق عادلانہ نظام کا قیام اور اُخروی خدمتِ خلق یعنی لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچانے اور ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے انہیں نیکی کی تلقین کرنا اور برائی سے روکنا ہے۔ فلاحِ اُخروی کے لیے محنت اور عمل درکار ہے جس کے حوالے سے تین تقاضے آیت زیر مطالعہ میں بیان ہوئے اور ایک اگلی آیت میں آ رہا ہے۔

آیت ۷۸ میں ارشاد ہوا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۷۸﴾﴾

''اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چُن لیا ہے اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں رکھی۔ (یہ دین) راستہ ہے تمہارے جدِّ امجد ابراہیمؑ کا۔ انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس سے پہلے اور اب بھی' تا کہ (روزِ قیامت) رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر۔ پس قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور چمٹ جاؤ اللہ سے۔ وہ تمہارا ولی اور مالک ہے' پس خوب مالک ہے اور خوب مددگار ہے۔''

جہاد فی سبیل اللہ: دین کے عملی تقاضوں کے حوالے سے چوتھا اور آخری تقاضا جہاد فی اللہ یعنی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ سے مراد ہے ایسی کشاکش اور محنت جس کا ہدف

اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔ اللہ عزوجل کی جتنی زیادہ معرفت ہوگی انسان اتنا ہی اللہ کے دین کی خدمت کے لیے تن من دھن لگائے گا‘ جیسا کہ سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ ’’بیشک میری نماز‘ میری قربانی‘ میرا جینا اور مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔‘‘ گویا ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں‘ میں اسی لیے نمازی!

آیت زیر مطالعہ میں جہاد کا حکم بہت تاکیدی انداز میں آیا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ ’’اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے‘‘۔ ویسے تو انسان پر نفس‘ والدین‘ اولاد‘ بیوی‘ قوم‘ وطن وغیرہ کا بھی حق ہوتا ہے تاہم سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔

شہادت علی الناس

آگے فرمایا: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ ’’اُس نے تمہیں چن لیا ہے‘‘۔ یہ جہاد کے تاکیدی حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کے احسان کا تذکرہ ہے۔ اجتباء کے معنی منتخب کرنے کے ہیں۔ انتخاب کی غرض و غایت شہادت علی الناس یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل کے ذریعے دین کے تقاضوں کی گواہی دے کر حجت قائم کر دینا ہے‘ اسی لیے زیر مطالعہ آیت میں فرمایا: ﴿لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ ’’تاکہ (روزِ قیامت) رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر‘‘۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے اُمتی ہونے کے ناطے سے نوعِ انسانی تک اللہ کا پیغام پہنچانا اس اُمت کی ذمہ داری ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) ’’اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی اُمت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول (آخر الزماں ﷺ) تم پر گواہ بن جائیں‘‘۔ اب انسانیت تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور لوگوں کے خلاف گواہی دینی ہے۔ آج ہم کسی سے پوچھیں کہ مرنے کے بعد یہودی کہاں جائے گا؟ تو مسلمان کہے گا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔ جب پوچھا جائے کہ تم کہاں جاؤ گے؟ تو فوراً کہے گا کہ میں جنت میں جاؤں گا۔ اگر وہ یہودی اللہ کے حضور عرض کرے کہ تیرا پیغام تو مجھ تک پہنچا ہی نہیں تو اللہ ہم سے پوچھے گا۔ ہم ختم نبوت پر ایمان

رکھتے ہیں۔ انسانیت کے سامنے گواہی پیش کرنے کی ذمہ داری اب ہماری ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر ((لِیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (رواہ البخاری) ’’پہنچا دیں حاضرین ان تک جو یہاں نہیں ہیں‘‘ یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ڈال دی ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ﴾ ’’اور تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں ڈالی‘‘۔ تمہیں ایسا دین عطا کیا گیا جو فطرت کے عین مطابق ہے‘‘۔ رہبانیت کی طرح کوئی غیر فطری پابندی اس میں نہیں ہے۔ نفس کے تقاضوں کو کچلنے کے بجائے انہیں صحیح رخ پر ڈھالا گیا ہے۔ انسان کی فطری جنسی تسکین کے لیے نکاح کا پاکیزہ راستہ عطا کیا گیا تاکہ انسان غیر فطری ہتھکنڈے اختیار کرنا شروع نہ کر دے۔

ہمارا اصل نام ’’مسلم‘‘ ہے!

آیت زیر مطالعہ میں ایک اور اہم بات بیان کی گئی ہے: ﴿مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا﴾ ’’اپنے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر (قائم رہو)! انہوں نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے بھی اور اب بھی‘‘۔ دین کے تقاضوں کی ادائیگی دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ وہ بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کے حقیقی والد اور بقیہ نوعِ انسانی کے روحانی والد ہیں۔ انہوں نے تمہارے لیے مسلم نام تجویز کیا۔ آج ایک طرف ہمارے نام دیوبندی‘ بریلوی اور اہلِ حدیث وغیرہ رکھ دیے گئے ہیں اور دوسری طرف ہم پنجابی‘ سندھی‘ بلوچی‘ پٹھان اور نہ جانے کیا کچھ ہیں۔ حالانکہ ہمارا اصل تعارف مسلم ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے ہمارے لیے دعا بھی کی تھی جو سورۃ البقرہ میں نقل کی گئی ہے: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠﴾ (آیت ۱۲۸) ’’اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنی فرماں بردار امت پیدا فرما‘‘۔ اُمت صرف دیوبندی یا صرف بریلوی یا صرف اہلِ حدیث نہیں‘ بلکہ سارے مسلمان اُمتِ مُسلمہ میں شامل ہیں۔ علمی اختلاف سر آنکھوں پر‘ ہم تمام مکاتبِ فکر کی قدر کرتے ہیں‘ لیکن علمی اختلاف کو علمی اختلاف کی حد تک رکھنا چاہیے اور اس کو فرقہ واریت کی شکل نہیں دینی چاہیے۔ بات ہمیشہ جوڑنے کی کرنی چاہیے‘ توڑنے کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک داعیٔ حق کو اپنا تعارف بطور مسلم ہی کرانا چاہیے‘ جیسا کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد ہوا: (باقی صفحہ 108 پر)

آنے والے دور میں عالمی سیاست کا مرکز

اصفہان

انجینئر مختار فاروقی

احادیث مبارکہ میں 'دجال' کے فتنہ کا زوردار تذکرہ ہے اور اس سے ہر پیغمبر (علیہ السلام) نے پناہ مانگی ہے۔ اس کے اصفہان سے ظاہر ہونے پر ستّر ہزار سیاہ پوش یہودی اس کے ہمراہ ہوجانے کا بھی ذکر ہے۔ انجینئر مختار حسین فاروقی صاحب نے اس موضوع پر مزید غور و فکر کر کے مواد اکٹھا کیا اور اپنا حاصل مطالعہ پیش فرمایا۔ محترم فاروقی صاحب کا یہ حاصل مطالعہ ماہنامہ حکمت بالغہ کے شکریہ کے ساتھ قارئینِ میثاق کی نذر کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

عالمی حالات ہمہ وقت تغیّر پذیر رہتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے' زندگی کے لمحات گزارتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔ انسانوں سے خاندان' قبائل' معاشرے' شہر اور ملک بنتے ہیں' اس کے بعد قوموں اور تہذیبوں کا درجہ آتا ہے۔ انسانی زندگی پچاس ساٹھ سال ہوتی ہے' جبکہ تہذیبوں کی زندگی پانچ چھ صدیاں ہوتی ہے۔ ماضی میں ہزاروں تہذیبیں اُٹھیں' عروج کو پہنچیں' غرور و تکبر اور ظلم پر اُتر آئیں اور پیوندِ خاک ہوگئیں۔ ایک تبصرے کے مطابق دنیا تہذیبوں کا قبرستان ہے۔ تاہم مشرقِ وسطیٰ اور اس کے آس پاس کے ممالک کئی لحاظ سے بہت اہمیت کے حامل ہیں اور طویل انسانی تاریخ رکھتے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی ایران کی حیثیت بہت نمایاں تھی اور یہ روم کے مقابلے میں عالمی طاقت تھی۔ اسلام کی آمد کے ساتھ ایران کی اہمیت اور بڑھ گئی اور اسلامی تاریخ میں بھی ایران کی حیثیت بڑی نمایاں رہی ہے۔

گزشتہ پانچ چھ صدیوں سے مغرب کی بالادستی کے باعث یورپ اور اب امریکہ عالمی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں اور لندن' امریکہ اور پیرس میں بیٹھے دماغ ساری دنیا کو کنٹرول کر رہے ہیں جبکہ اسلام کے دور کے اہم شہر اپنی اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ کوفہ و بغداد قصۂ ماضی بن چکے

ہیں۔ دورِ حاضر میں اب قوت کے نئے مراکز وجود میں آرہے ہیں۔

علامہ اقبال گزشتہ صدی کے آغاز میں تعلیم کے لیے یورپ گئے تھے اور ۱۹۰۷ء میں واپسی ہوئی۔ انہوں نے برطانیہ اور جرمنی میں وقت گزارا اور یورپی تہذیب کو قریب سے دیکھا اور اپنے ذہن رسا کے ذریعے یورپ کی تیز رفتار ترقی کی حقیقت اور اس کے پس پردہ کارفرما نظریات و افکار کو سمجھ لیا۔ تعلیمی ضروریات کی وجہ سے انہیں خاص طور پر ایران کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملا اور اس طرح ماضی اور حال کے تقابل سے اسلامی نقطہ نظر سے حالات کا تجزیہ کرنے کا ایسا سلیقہ ہاتھ آیا جس کا لوہا آج بھی دنیا مانتی ہے۔ انہوں نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ ؎

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کُرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

برٹرینڈ رسل برطانیہ کا مشہور فلسفی ادیب اور تجزیہ نگار گزرا ہے' اس نے اپنی کتاب "Re-awaking East" میں لکھا ہے کہ تاریخ میں قوموں کا عروج و زوال مشرق و مغرب میں باری باری یکے بعد دیگرے سامنے آتا رہا ہے اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ مشرق و مغرب کے مابین جھولا جھولتی رہی ہے۔ آج سے ستّر برس قبل اُس نے لکھا تھا کہ مغرب کے موجودہ عروج کے بعد زوال تو لازمی ہے' اب دوبارہ مشرق کی باری ہے اور اہل علم دیکھ رہے ہیں کہ اگرچہ وسائل اور زندگیوں کی آسائشوں کے ساتھ طاقت کا توازن ابھی یورپ اور امریکہ کے پاس ہے' تاہم مستقبل کے مراکز امارات اور خلیج فارس سے لے کر بحیرۂ روم تک منتقل ہو رہے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ عالمی سطح پر نگاہوں کے سامنے آگیا ہے۔ عراق اور افغانستان میں امریکی مداخلت بھی آنے والے دور میں اس خطہ کی اہمیت کے پیش نظر ہے اور اسی مداخلت اور جارحیت کے تحت مستقبل کے دھندلے نقوش واضح ہونا شروع ہو رہے ہیں۔

اس تناظر میں ''مشرقِ وسطیٰ'' میں برادر ملک ایران کی اہمیت نمایاں ہے اور گزشتہ انقلاب کے بعد اس نے عالمی سیاست میں اپنی حیثیت کو منوایا ہے۔ حالیہ امریکی صلیبی یلغار کے بعد ایران نے جس طرح امریکی دباؤ اور اقوام متحدہ کی پابندیوں کی دھمکیوں کا منہ توڑ جواب دیا ہے وہ اقوام عالم اور بالخصوص دیگر مسلمان ممالک کے لیے حیران کن ہے۔ پاکستان کی طرح ایران کے ایٹمی ہتھیاروں کے بارے میں مغرب کی منافقانہ پالیسی' بلاوجہ سفارتی دباؤ اور بلاجواز عالمی

پروپیگنڈا ایران کے استقلال میں کوئی لغزش پیدا نہیں کر سکا۔ اور تا حال کسی دھمکی سے بھی ایران کو جھکا لینے کا امکان نظر نہیں آ رہا۔ (کل کیا ہوگا یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔)

دارالحکومت تہران کے بعد ایران کا ایک اہم شہر اصفہان ہے' جو تاریخی' ثقافتی اور مذہبی لحاظ سے بڑا اہم شہر ہے۔ گزشتہ چند سالوں کے دوران کچھ ایک ایسے نکات سامنے آ گئے ہیں جو اوپر درج پس منظر میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ قارئین تک بھی یہ حقائق پہنچا دیے جائیں تاکہ انہیں بھی آئندہ حالات کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے میں آسانی رہے۔

جغرافیائی لحاظ سے اصفہان —— موجودہ ملک ایران کا ایک وسطی صوبہ ہے' تقریباً ۵۲ درجے طول بلد اور ۳۲ درجے عرض بلد پر واقعہ ہے۔ اصفہان شہر کی تاریخ تقریباً ۲۵۰۰ سال پرانی ہے اور ثقافتی لحاظ سے بڑا مرکز ہے۔ مساجد اور مدارس کی خوبصورتی کے علاوہ عمومی فنِ تعمیر میں دنیا کے چند ممتاز شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں کے قالین اور فن تعمیر میں رنگدار روغنی ٹائلیں بہت مشہور ہیں۔ فن تعمیر کے نادر نمونے اس صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نقش جہاں اسکوئر (عام طور پر جسے امام اسکوئر بھی کہتے ہیں) اہم عمارات اور تجارتی مراکز کے درمیان شاہراہوں سے گھرا ہوا ایک وسیع اسکوئر ہے' جو غالباً آج بھی دنیا بھر کے مشہور شہروں میں واقع اسکوئروں میں سب سے بڑا ہے۔

مذہبی لحاظ سے بھی یہ شہر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ سولہویں صدی میں جب صفوی خاندان کی حکومت بنی اور اس میں استحکام آیا تو اس خاندان کے مشہور بادشاہ اسماعیل صفوی نے اصفہان کو پایۂ تخت قرار دیا اور یوں اس شہر کی ترقی ہوئی۔ یہاں سے قریب ہی شیعہ مسلک کی قدیم درسگاہیں اور مراکز ہیں۔ قم ۱۵۰ کلومیٹر پر ہے' ذرا فاصلے پر خمین ہے جہاں مشہور علمی درسگاہیں ہیں۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مؤلف جناب سیّد قاسم محمود صاحب اصفہان کے عنوان سے رقمطراز ہیں:

> ''وسطی ایران کا ایک شہر' جو اپنی حسین مسجدوں کی وجہ سے مشہور ہے' ایک زمانے میں صفویوں کا دارالحکومت تھا۔ اسے بابل کے حکمران نبوکدنضر (بخت نصر) نے یہودیوں کو بسانے کے لیے آباد کیا تھا۔ مسلمانوں نے اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ۱۹ھ/ ۶۴۰ء میں فتح کیا تھا۔ طبری کے نزدیک فتح کا سال ۲۱ھ/ ۶۴۲ء ہے۔ ایک اور روایت کے مطابق ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نہاوند کے بعد اصفہان کو فتح کیا۔ المعتز کے عہد میں ایک

بغاوت کے بعد ۲۴۷ھ/ ۸۶۱ء میں اسے دوبارہ فتح کیا گیا۔ اس بار شہریوں کی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی۔ اس وقت وہاں ایک قلعہ نما عمارت موجود تھی' نیز شہر کے گرد فصیل تھی' جس میں چار دروازے اور ایک سو منارے تھے۔ شہر کے قرب و جوار میں چاندی' تانبے' جست اور سرمے کی کانیں تھیں۔

۳۰۱ھ/ ۹۱۳ء میں یہ شہر سامانیوں کے قبضے میں آیا۔ ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں غزنویوں کی قلمرو میں شامل ہوا۔ مغلوں کے حملے کے دوران میں شاہ خوارزم سلطان جلال الدین منگو کے زیر کمان اس شہر کی دیواروں تلے ایک بہت بڑی جنگ لڑی گئی۔ بعد میں یہ شہر مغلیہ سلطنت کا حصہ بن گیا۔ تیمور نے یہاں ستر ہزار شہریوں کا قتل عام کیا۔ اس کے بعد کئی حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں کا قتل عام جاری رکھا۔ نادر شاہ کے عہد میں (۱۱۴۱ھ/ ۱۸۲۹ء) کہیں جا کر یہاں امن ہوا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ شہر عالمی طاقتوں کی آویزش کا مرکز رہا۔ ۱۹۱۷ء میں اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تاریخ میں اس شہر کو پہلی بار کسی حکومت کا مرکزی شہر بننے کا شرف عباس اول (۱۵۸۶ء تا ۱۶۲۸ء) کے عہد میں حاصل ہوا۔ اس نے ایک خوب صورت شہر بنا دیا۔ اس نے دریائے زندہ رود پر تین خوبصورت پل تعمیر کرائے۔ نیز ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کرائی۔ شاہ صفی اول نے اس پر چاندی کے پترے چڑھوائے۔ بعد میں کئی حکمرانوں نے یہاں خوب صورت عمارات تعمیر کرائیں' جن میں گھنٹہ گھر' شاہی محلات' کاروان سرائے' منار خواجہ عالم' قلعہ تبرک' مدرسہ نادر شاہ' شیخ لطف اللہ کی مسجد' عالی قاپو (سات منزلہ عمارت)' میدانِ شاہ اور چہار باغ قابل ذکر مقامات ہیں۔

بیسویں صدی کا اصفہان ایک صنعتی شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے عہد (۱۹۲۵ء تا ۱۹۴۱ء) میں یہاں صنعتی علاقہ تعمیر کیا گیا۔ یہاں کپڑے کے بے شمار کارخانے قائم ہیں۔ نیز دھات کا بہترین کام ہوتا ہے' جس میں چاندی' تانبے اور جست کی صنعتیں قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں آبادی آٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔''

اصفہان —— ایک نادرِ روزگار شہر اور ثقافتی و مذہبی اہمیت کا حامل صوبہ مستقبل میں عالمی حیثیت اختیار کرنے والا ہے۔ مستقبل سے مراد صرف چند سال بھی ہو سکتے ہیں اور چند عشرے بھی (واللہ اعلم بالصواب!) اصفہان کے بارے میں تین مختلف زاویوں یا نقطہ ہائے نگاہ سے اہمیت کے تین پہلو حسب ذیل ہیں:

بنی اسرائیل یعنی یہود یا صہیونیت کے نقطہ نظر سے

بنی اسرائیل کی تاریخ چار ہزار سال کا پھیلاؤ رکھتی ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے واقعات ملا کر دیکھنا ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق ملک میں تھے جہاں آج سے ۴۱۰۰ سال پہلے نمرود بادشاہ حکمران تھے جو بدترین شرک میں مبتلا تھے۔ اور بت پرستی کا نظام تھا' بادشاہ خود بھی خدائی کے دعویدار ہوتے تھے۔

تاریخ انبیاء کے بارے میں قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبری اور کتاب رکھ دی تھی۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کے بعد صرف ان کی اولاد ہی میں نبوت اور رسالت کا سلسلہ جاری ہوا یعنی بعد کی نسل انسانی صرف انہی کی اولاد پر مشتمل ہے اور دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو پیغمبری اور وحی کے لیے منتخب فرما کر اٹھایا تا کہ ایک حزب اللہ بن سکے' اس لیے کہ انسانیت اب طفولیت سے نکل کر بلوغ (maturity) میں قدم رکھ رہی تھی اور انسانی ہدایت کے باب میں معاملہ ختم نبوت کی طرف جانا تھا' جس کے نتیجے میں ختم نبوت کے بعد ہدایت و رہنمائی کے معاملات آخری آسمانی وحی کی روشنی میں اُمتِ مُسلمہ کے ہاتھوں میں آنے تھے اور دوسری طرف ختم نبوت کے نتیجے میں آسمانی مدد کا پہلو بھی انبیاء کرام علیہم السلام کے مقابلے میں قدرے ہلکا ہونا فطری بات تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جہاد کے باب کو کھولا اور معجزات یعنی (Divine Intervention) کا پہلو بھی اب ''کرامات'' تک آ گیا۔ مسلم امت کے دنیا میں غلبہ کا انحصار انسانی جدوجہد یعنی جہاد و قتال پر ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ میں آباد کیا گیا جہاں چاہ زمزم جاری ہوا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ پیش آیا۔ پھر بیت اللہ کی تعمیر اور آبادکاری کا مرحلہ آیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو فلسطین (یروشلم) میں آباد کیا تھا' اُن کے بیٹے یعقوب علیہ السلام اور پوتے حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا جہاں سے وہ مصر پہنچے اور بالآخر مصر کے حاکم بن گئے۔ برادرانِ یوسف کی بے وفائی سے ہی ایک طبقہ پیدا ہوا جو انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے بُعد اختیار کرتا چلا گیا۔ مصر میں ہی ۱۳۰۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ انہوں

نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔ فرعون کی غلامی کے دور میں ہی اہرامِ مصر کی تعمیر کے دوران بنی اسرائیل میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو اللہ اور اس کے رسولوں کا باغی بن گیا اور یہ طبقہ ''Free Masons'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں بنی اسرائیل کو آزادی ملی۔ تاہم سامری کی شخصیت سامنے آ گئی۔ پھر بنی اسرائیل نے جہاد سے انکار کر دیا۔ صحرائے سینا میں چالیس سال کی سزا پائی۔ پھر جہاد پر راغب ہوئے تو سلطنت ملی جو کئی مرحلوں سے گزر کر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت کے دور میں عروج کو پہنچی۔ پھر بنی اسرائیل میں جادو کا زور ہوا۔ ہاروت و ماروت کا واقعہ قرآن مجید میں ہے۔ یہیں سے یہود کے باغی گروہ نے ''قبالہ'' نام سے علم ایجاد کیا یعنی علم الاعداد۔ اب تورات کی عبارت نہیں پڑھی جاتی تھی' بلکہ تورات کے الفاظ کے (خود ساختہ) اعداد پر آیات کا ایک ''نمبر'' (عدد) بنا لیا جاتا تھا' جس سے اس آیت کی برکت حاصل کی جاتی تھی (جیسے ہمارے ہاں ۷۸۶ لکھ کر بسم اللہ شریف مراد لی جاتی ہے)۔

چھٹی صدی ق م میں یہود پر زوال آیا اور انہوں نے قتلِ انبیاء جیسا جرم شروع کر دیا۔ حق کے انکار کا آخری درجہ کہ حق بات کہنے والے کا نام و نشان ہی مٹا دو تا کہ کوئی حق کا علمبردار سامنے نہ ہو اور باغی لوگ من مانی کرتے رہیں۔ اس پر عراق کے بادشاہ نمرود بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور تورات کے بیان کے مطابق بیت المقدس میں چھ لاکھ بنی اسرائیل قتل کر دیے اور چھ لاکھ کو بھیڑ بکریوں کی طرح قیدی بنا کر عراق لے جایا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعمیر کردہ عبادت گاہ ہیکل سلیمانی کو مسمار کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں اس واقعہ کو بنی اسرائیل کے فسق و فجور اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ساتھ قتل انبیاء علیہم السلام کی سزا کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ چھ لاکھ یہودیوں کو نمرود بادشاہ بخت نصر نے کئی جگہ پر آباد کیا تھا۔ بنی اسرائیل کی یہ قید ۱۵۰ سال پر محیط تھی جس میں کئی نسلیں بیت گئیں۔

سیّد قاسم محمود صاحب مؤلف اسلامی انسائیکلو پیڈیا نے اصفہان کی پہلی آبادکاری کے ضمن میں یہود کی اس قید کے زمانے کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں ایران کے مسلمان بادشاہ کیخورس یا سائرس یا ذوالقرنین نے عراق فتح کیا تو یہود کو آزادی دلائی اور ان کو بیت المقدس میں دوبارہ آباد ہونے میں مدد بھی دی۔ اب یہود میں دینی جذبات تازہ تھے۔ انہیں دوبارہ حکومت بنانے کا

موقع ملا‘ مکابی سلطنت کے نام سے سلطنت بنی‘ بیت المقدس کی تعمیر ثانی ہوئی‘ مگر جلد ہی یہ حکومت زوال سے دوچار ہوگئی۔ بنی اسرائیل کے باغی طبقات جواب قتلِ انبیاءؑ جیسے جرائم کی وجہ سے حزب الشیاطین کا درجہ حاصل کر چکے تھے سر برآوردہ لوگ تھے‘ لہٰذا سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے غلامی و محکومی سے دوچار کر دیا اور پورے فلسطین کے علاقے پر رومیوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے۔ یہود کے علماء و احبار نے ان کی بات نہ سنی بلکہ اپنی بگڑی ہوئی افتادِ طبع کے زیر اثر‘ برنباس کی انجیل کے بیان کے مطابق‘ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رومیوں کے ذریعے صلیب پر لٹکانے کا اہتمام کر دیا۔ قتل انبیاءؑ کے بعد ’’رسول‘‘ کے انکار کے اس ’’جرم‘‘ کے نتیجے میں بنی اسرائیل (صہیونی یا فری میسنوں) پر زوال آ گیا۔ ٹائٹس رومی نے یروشلم پر ۷۰ء میں حملہ کیا اور دوسری مرتبہ بیت المقدس گرا دیا گیا۔ یہود کو دیس نکالا دیا اور اس طرح یہود اپنے جرائم اور قتل انبیاء کی وجہ سے عذاب الٰہی کا شکار ہو گئے۔ ہدایت سے محروم ہو کر یہود فلسطین سے بے گھر ہو کر پوری دنیا میں منتشر ہو گئے۔ یہود کا یہ دور انتشار کا دور (Diaspora) کہلاتا ہے۔ ۷۰ء میں فلسطین سے نکل کر یہود پوری دنیا میں پھیل گئے۔ مدینہ میں بھی اس دور میں آ کر یہود آباد ہوئے۔ اصفہان میں بھی (سابقہ تعلق کی بنیاد پر) یہود کی پہلی آبادی غالباً ۲۰۴ء کی ہے۔ یہ طویل ’’جملہ معترضہ‘‘ اصفہان اور یہود کے باہمی تعلق کے اظہار کے لیے ضروری تھا۔ ضمنی طور پر یہ بات بھی بنی اسرائیل کے بارے میں سامنے رہے تو آگے کا استدلال زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر یہود نے من حیث المجموع ان کا صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ان کو ستایا بھی اور فتویٰ دے کر واجب القتل قرار دیا اور سولی (execution) کی سزا کے اجراء کے لیے رومی گورنر کے حوالے کر دیا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچا لیا اور قرآن مجید کے بیان ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ (النساء:۱۵۷) کے مطابق کوئی اور شخص ان کی جگہ سولی پر چڑھا دیا گیا‘ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔ اس واقعہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تورات اور سابقہ انبیاء کی بشارتوں کے مطابق بنی اسرائیل (یہود) کے نزدیک اصلی عیسیٰ علیہ السلام ابھی آنے ہیں اور یہود ان کے منتظر ہیں۔ (جبکہ مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھا لیے گئے تھے‘ وہ ابھی زندہ ہیں اور دوبارہ تشریف لائیں گے۔)

یہود کے نزدیک ان کی مذہبی پیشگوئیوں کے مطابق ابھی ’’عیسیٰ‘‘ نامی پیغمبر آنے والے ہیں‘

ان کے بارے میں ان کا اپنا ایک ذہن ہے۔ وہ کہاں آئیں گے؟ اس کے بارے میں ہم مسلمانوں کو معلومات کی حد تک تحقیق و جستجو تو ہو سکتی ہے اور یہ بات فطری ہے کہ پھر حق و باطل کا کوئی معرکہ گرم ہونے والا ہے۔ تاہم اس بارے میں ایک واضح اشارہ چند سال پہلے ہی سامنے آیا ہے جس کا تعلق اصفہان سے ہے اور جس کے راوی بھی ایک معتبر شخص ہیں اور زندہ ہیں۔

جناب اوریا مقبول جان ایک معروف صحافی اور لکھنے والے ہیں‘ ان کا یہ کالم روزنامہ ایکسپریس میں چھپا‘ جسے بعد میں ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور نے اپنے شمارہ نمبر ۲۷ جولائی ۲۰۰۹ء میں بطور ’’کالم آف دی ویک‘‘ کے نام سے شائع کیا۔ ہم ندائے خلافت کے حوالے سے اقتباس یہاں درج کر رہے ہیں۔ یہود کے بارے میں اوپر درج تمہیدی باتیں ذرا ذہن میں تازہ کر کے‘ سابقہ صدی میں اسرائیل کے فلسطین پر غاصبانہ قبضے کے پس منظر میں اس حوالہ پر غور کیجئے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ’’اسرائیل کے بننے سے پہلے ایران میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودی آباد تھے‘ لیکن وہ اسرائیل کی آبادی کے لیے وہاں چلے گئے مگر انہوں نے ایک شہر کو نہیں چھوڑا اور وہ شہر تھا اصفہان۔ اس وقت وہاں تیس سے پینتیس ہزار یہودی آباد ہیں اور ان کی ایرانی پارلیمنٹ میں ایک نشست ہے۔ اس وقت سیاماک موراس رنگ یہودیوں کی پارلیمنٹ میں نمائندگی کرتا ہے۔ تہران میں گیارہ یہودی عبادت خانے اور تین یہودی سکول ہیں۔ ان کا اپنا اخبار ’’دفاع بنا‘‘ نکلتا ہے۔ ان کی ایک مرکزی لائبریری ہے اور ایران کا سب سے بڑا خیراتی ہسپتال ڈاکٹر سپیر یہودی ہسپتال ہے۔ یہ ہسپتال اگرچہ یہودی خیرات سے چلتا ہے لیکن اس کے اکثر مریض مسلمان ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت دانیال علیہ السلام کا مزار بھی یہاں ہے اور اس مزار پر ایک سبز چادر پڑی ہوتی ہے جس پر وہی ستارہ ہے جو اسرائیل کے پرچم پر ہے جسے حضرت داؤد علیہ السلام کا ستارہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ان کے مزارات ہیں جن پر یہ ایرانی یہودی مستقل حاضری دیتے رہتے ہیں۔
>
> مئی ۲۰۰۸ء میں چاہ بہار میں ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد جب میں تہران کے ہوٹل میں آیا تو مجھے وہاں آسٹریا کا ایک یہودی رِبّی (یعنی ان کا مولوی) ملا جو اپنے مخصوص لباس میں ملبوس تھا۔ میں نے پوچھا تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ کہنے لگا: میں بین المذاہب کانفرنس میں آیا ہوں۔ میں نے پوچھا: یہاں یہ کانفرنس کیوں؟ اس نے

کہا کہ ہماری کتب کے مطابق ہمارا مسیح یہاں سے خروج کرے گا اور ہمیں یروشلم واپس دلائے گا۔''

اور یہ بات اب عام ہے کہ قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں اہلِ سُنّت کے عقائد کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا بھی وقت قریب ہے اور مغرب میں بھی اس موضوع پر مسلسل کتابیں چھپ رہی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام آیا چاہتے ہیں اور بنی اسرائیل یہود کے اعتقادات کے مطابق ان کے ''مسیح'' کی آمد کا وقت بھی قریب ہے جو اصفہان سے ظاہر ہوگا۔ لہٰذا —— مستقبل قریب میں اصفہان کی عالمی اہمیت اور سیاست کا محور و مرکز قرار پانا لازمی و لابدی ہے۔

اصفہان —— قرآن وحدیث کی روشنی میں اہلِ سُنّت کے نزدیک

مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور آج بھی اپنے اصل متن کے ساتھ موجود ہے۔ علم و ہدایت کا منبع بھی یہی ہے اور قانون کا ماخذ اوّل بھی۔ یہی آخری الہامی کتاب ہے۔ اہل سنت کے نزدیک قرآن مجید کے بعد علم و قانون کا ماخذ و سرچشمہ احادیثِ رسول ﷺ ہیں، جن کے سب سے زیادہ معتبر مجموعے چھ ہیں (صحاحِ ستّہ) صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ۔ یہ لفظ 'صحیح' جو حدیث کے ساتھ بولا جاتا ہے یہ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے، نہ کہ عرفِ عام کا لفظ صحیح کہ اس کے علاوہ باقی سب حدیثیں غلط ہیں۔

صحیح مسلم میں باب الفتن میں قرب قیامت کے احوال میں کئی احادیث مروی ہیں جن میں ''دجال'' کی آمد اور اس کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے۔ اس پس منظر میں یہ حدیث بھی آتی ہے کہ

عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ أنَّ رسُولَ اللہ ﷺ: قال ((یَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ یَہُوْد أَصْبَہَانَ سَبْعُوْنَ اَلْفًا عَلَیْہِمُ الطَّیَالِسَۃُ)) (مسلم)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اصفہان کے یہود سے ستر ہزار دجال کی پیروی کریں گے جنہوں نے (سیاہ) جُبّے (gown) پہنے ہوں گے۔''

''دجل'' عربی لفظ ہے، اس سے فعّال اور کذّاب کے وزن پر ''دجال'' کا لفظ آیا ہے۔ دجال کے

لفظی معنیٰ ہیں بہت بڑا دھوکے باز۔ یہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں یہ فتنۂ دجال کا دور ہے۔ احادیث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک شخص معیّن بھی آئے گا جو دجال کہلائے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے اہلِ ایمان کے لیے فتنہ دجال کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا فتنہ قرار دیا ہے اور اس دور میں اہلِ ایمان پر بہت زیادہ مشکلات اور ابتلائیں ہوں گی۔ آسمان سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور سنن ترمذی میں روایت ہے کہ

((یَقْتُلُ ابْنُ مَرْیَمَ الدَّجَّالَ بِبَابِ لُدّ))

''حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام باب لُد پر دجال کو قتل کریں گے''

''لُدّ'' یروشلم کا قدیم شہر ہے جو آج کل اسرائیل میں شامل ہے، یہاں اسرائیل کا بہت بڑا ائیر بیس ہے، یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ''دجال'' کو قتل کر دیں گے۔ گویا اصفہان سے دجال کے نکلنے کے بعد خیر و شر کی قوتیں صف آرا ہوں گی اور دجال کی عمل داری اسرائیل تک پھیل جائے گی، جہاں خیر و شر کے ایک معرکے میں دجال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔

اہلِ سنت کے نزدیک بھی مستقبل قریب میں اصفہان سے لے کر بحیرۂ روم تک خیر و شر کا معرکہ بپا ہونے والا ہے، جس میں کئی مرحلوں سے گزر کر بالآخر فتح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معیت میں لڑنے والے لشکر حق (مسلمانوں) کی ہوگی۔

اثنا عشری شیعہ حضرات کے نزدیک اصفہان کی اہمیت

شیعہ مسلک میں اصفہان کی اہمیت اسماعیل صفوی کا اسے دارالحکومت بنانے سے ہی واضح ہے۔ پھر یہاں نقشِ جہاں اسکوئر جسے امام اسکوئر بھی کہتے ہیں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شہر اور بالخصوص امام اسکوئر بہت اہم مقام ہے۔

اثنا عشری شیعہ حضرات امامت کے قائل ہونے کی بنا پر بارہ اماموں پر یقین رکھتے ہیں، جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ تک گیارہ نامور شخصیات ان کے نزدیک امامت کے منصب پر فائز تھیں، جبکہ بارہویں امام ''مہدی'' پیدا ہوئے تھے اور اس وقت سے اب تک روپوش ہیں۔ شیعہ مسلک کے مطابق انہیں دوبارہ آنا ہے اور یہ ''ظہورِ مہدی'' کا دور شیعہ مسلک کے عروج کا دور ہوگا اور ان پر تاریخ میں جو مشکلات آئی ہیں ان کا ازالہ بھی اسی دور میں ہوگا۔

اصفہان کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ امکان غالب ہے کہ شیعہ مسلک کے مطابق ان کے ظاہر ہونے والے بارہویں امام اسی علاقے میں آئیں گے‘ لہٰذا اس پہلو سے بھی اصفہان کی اہمیت نوشتۂ دیوار (writing on the wall) ہے کہ شیعہ مسلک کا تابناک مستقبل اسی علاقے سے وابستہ ہے اور یہ علاقہ ان کی اُمیدوں کا مرکز ہے۔

مستقبل میں عالمی‘ مقتدر اور مذہبی اہمیت کی حامل تین شخصیات اصفہان کے علاقے سے ظہور پذیر ہوں گی۔ یعنی بنی اسرائیل (یہود) کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام (جن کا ذکر ان کی کتابوں میں ہے)‘ اہل سنت کے نزدیک دجال اور اثنا عشری شیعہ حضرات کے نزدیک ان کے ایک امام غائب کا ظہور ہوگا جو ان کے نزدیک بارہویں امام ہیں اور ’امام مہدی‘ کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا —— اس علاقے کا آنے والے دور میں عالمی اہمیت اختیار کر جانا اور عالمی سیاست کا مرکز و محور قرار پانا ایک یقینی امر ہے۔ یہ تینوں عالمی شخصیات بیک وقت ظاہر ہوتی ہیں یا کسی خاص خدائی تدبیر کے تحت آگے پیچھے یا وقفے وقفے سے یکے بعد دیگرے‘ یہ مستقبل کی بات ہے اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اتنی بات یقینی ہے کہ خیر و شر کا ایک بڑا معرکہ مشرقِ وسطیٰ کے علاقے (اور اس سے ملحقہ ملکوں) میں ہوگا جس سے اولاً بہت بڑی تباہی آئے گی اور بالآخر مسلمانوں کے حق میں خیر برآمد ہوگا۔

ہماری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنے والے ان حالات میں مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت فرمائے‘ انہیں فتنہ کے دور میں حق کا ساتھ دینے کی توفیق دے اور اس معرکے کو اُمّتِ مُسلمہ کے لیے فتح و کامرانی کی نوید بنا دے (آمین!)

(یاد رہے کہ اہل سنّت کے نزدیک بھی قربِ قیامت میں ایک مسلمان رہنما سامنے آئے گا جو مسلمانوں کو فتح دلائے گا‘ مگر وہ مکّہ مکرمہ کے علاقے میں ہوگا۔ اس کا لقب بھی احادیث میں ’’مہدی‘‘ یعنی ہدایت یافتہ آیا ہے اس سے غلط فہمی کا امکان ہے جسے دور کر لینا چاہیے۔)

ہمیں ان سطور کے لکھنے اور اصفہان کو عالمی سیاست کا مرکز قرار پانے سے صرف اتنی دلچسپی ہے کہ یورپی استعمار کا خاتمہ ہوگا اور امریکی بے رحم‘ ظالم اور انسان نما حیوان (beasts) کارپردازوں اور منصوبہ سازوں کا غرور و استکبار خاک میں مل جائے گا اور ایرانی صدر کے ایک اخباری بیان میں دی گئی دھمکی (اور خواہش) پوری ہو جائے گی کہ اسرائیل (صہیونیت) کا وجود

صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ بقول برٹرینڈ رسل مغرب سے طاقت و اقتدار کا ’’ہما‘‘ مشرق میں آ جائے گا اور اس طرح آنے والے دور میں سیکولرازم کی جگہ خدا پرستی اور لبرل ازم کی جگہ شرم و حیا اور اخلاق کا دور دورہ ہوگا‘ جس سے صرف اس علاقے کے لوگ ہی نہیں‘ کل روئے ارضی پر موجود ساری انسانیت سکھ کا سانس لے سکے گی اور انسانی اخوت‘ مساوات اور حقیقی آزادی کا خواب حقیقت بن جائے گا۔ بقول اقبال ؎

پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!

❁❁❁

بقیہ: شہادت علی الناس

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳﴾ (آیت ۳۳) ’’اور اس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔‘‘

دعا ہے کہ اللہ ربّ العزت ہم سب کو دین اسلام کے عملی تقاضوں پر عمل کرنے اور شہادت علی الناس کے فریضہ کو اس کی صحیح روح کے مطابق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

''چھوٹے'' روزے سے ''بڑے'' روزے کی جانب

رانا عرفان علی

ماہِ صیام اپنی رحمتیں، مغفرتیں اور برکتیں بانٹتا ہوا رخصت ہوا۔ دعا ہے کہ ربّ کریم اپنے بندوں کی عبادات کو درجہ قبولیت عطا فرماتے ہوئے گزشتہ گناہوں سے بخشش کا پروانہ ((غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ)) عطا فرمائے۔ آمین!

سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۳ میں روزے کا بنیادی مقصد اور حاصل ''تقویٰ'' معیّن ہوا۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے الفاظ کی روشنی میں تقویٰ زندگی کی اس روش اور احساس کا نام ہے جس میں بندۂ مؤمن ہر لحظہ اس بات کا دھیان رکھے کہ کہیں اس کا دامن دنیاوی آلائشوں میں اُلجھ کر اپنے رب کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔ ماہِ صیام بندۂ مؤمن کی تربیت ذات کے لیے دوگانہ پروگرام کا درجہ رکھتا ہے۔ اول یہ کہ اپنے حیوانی جذبات کو لگام دے کر ضبطِ نفس کی مشق، اور ثانیاً نورِ قرآن کی بارش کے ذریعے تجلیۂ روح اور ایمان کی آبیاری۔ زمانہ گواہ ہے کہ دوسری عبادات کی طرح روزے کو بھی اس کے اصل مقصود (تقویٰ) سے بے اعتنائی برتتے ہوئے ایک رسم بنا دیا گیا اور نتیجتاً معاشرہ روزے کے روحانی ثمرات سے محروم ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں، تو باقی نہیں ہے!

جن بندگانِ رب کو رمضان کی سعادتوں سے کسی درجے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا ہے، ان میں سے بھی ایک عظیم اکثریت رمضان کے بعد رمضان کے پیغام کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتی ہے اور ان کی زندگی تقویٰ کی روشنی میں اپنا سفر کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ اگر رمضان المبارک کو بارگاہِ حق سے قوتِ گویائی عطا ہو جائے تو شاید مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں بندۂ مؤمن سے

فریاد رساں ہو۔

۱) اگر میری بدولت تقویٰ کی کچھ پونجی نصیب ہوئی ہے تو اسے حرزِ جاں بناؤ۔ سفرِ حیات میں اس زادِ راہ کو اپنے لیے توشہ بناؤ اور ﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ (الحشر:۱۸) ''ہر جان کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے!'' کے مصداق ہر دم تمہیں یہ فکر دامن گیر رہے کہ کل (حیاتِ اخروی) کے لیے کیا جمع پونجی ہے۔ دیکھو! تقویٰ کی یہ روش رمضان تک ہی محدود نہ رہے، بلکہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر حالت فرمانبرداری میں۔'' کی روشنی میں زندگی کی آخری سانس تک ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' کی مثال بنے رہو۔ سن رکھو! جو رمضان کی عبادت کرتا تھا اسے جان لینا چاہیے کہ رمضان رخصت ہو چکا اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ جان رکھے کہ اللہ الحیّ (زندہ) اور القیّوم (قائم رکھنے والا) ہے اور اس کی ربوبیت صرف رمضان تک محدود نہیں۔ لہٰذا بندۂ مؤمن کے لیے ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾ (الحجر) ''اور اپنے رب کی بندگی میں لگے رہو یہاں تک کہ یقینی شے (موت) وقوع پذیر ہو جائے''، مشعلِ راہ رہنا چاہیے۔

دیکھو کہیں تمہارا معاملہ سورۃ النحل کی آیت ۹۲ کی روشنی میں اس عورت کی مانند نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر خود ہی اسے تار تار کر ڈالا۔

۲) ماہِ رمضان میں حیوانی تقاضوں کو لگام دیے رکھی اور ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ کی حلال کردہ اشیاء سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ اب رمضان کے بعد اللہ کے حرام کردہ امور سے بچتے رہنا۔

۳) ماہِ صیام میں نورِ قرآن سے تجلیۂ روح اور ایمان کی آبیاری کرتے رہے، اب سال کے باقی مہینوں میں اس نور کو بجھنے نہ دینا۔ جس ایمان کی آبیاری کی ہے اب اس دولت کی حفاظت بھی کرنا کہ تمہارا دشمن شیطانِ لعین ہر دم تمہاری تاک میں ہے۔ یاد رکھو! قرآن رمضان میں نازل ہوا ہے، لیکن صرف رمضان کے لیے نازل نہیں ہوا، بلکہ یہ تو ہر لحظہ اور زندگی کے ہر موڑ پر تمہارے لیے مینارۂ نور ہے۔ اللہ کی اس نعمت بے بہا کی قدردانی کرنا، اسی کو اپنا امام بنانا، اس کے نور کی روشنی

میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا اور یہی کلامِ الٰہی تمہارا صبح وشام کا وظیفہ ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں قرآن تمہارے حق میں حجت ثابت ہوگا۔ بصورتِ دیگر خدانخواستہ یہ بارگاہِ الٰہی میں تمہارے خلاف حجت بنے گا۔

۴) قربِ الٰہی کی جس قدر دولت رمضان المبارک میں نصیب ہوئی' از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ﴾ ''اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (جان لو) میں قریب ہی ہوں''۔ اور راز و نیاز اور دعا و مناجات کا جو سلسلہ رمضان میں قائم ہوا' اسے اپنی زندگی کا لازمی جزو بنا لو۔ اللہ کی جانب سے ﴿اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرۃ:۱۸۶) ''میں پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہتا ہوں وہ جب کہیں اور جہاں کہیں مجھے پکارے'' کا مژدۂ جانفزا صرف رمضان تک محدود نہیں' وہ تو ہر پل ''مائل بہ کرم'' ہے۔ صرف تمہیں ''رہرو منزل'' بننے کی ضرورت ہے۔ بس مانگنے کے کچھ آداب و شرائط اور سلیقہ ہوا کرتا ہے جو تمہارے پیش نظر رہنا چاہیے۔ قبولیت دعا کے لیے تمہارے رب نے ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں'' اور ﴿وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ ''اور مجھ پر (حقیقی) ایمان رکھیں'' شرائط مقرر فرما دی ہیں۔

﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ﴾ کے تقاضے کے تحت جس رب کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہو' غیر اللہ سے کٹ کر صرف اُسی کے ہو رہو اور اُسی کی اطاعت کرو۔ یاد رکھو! اللہ کے ہاں جزوی اطاعت ناقابل قبول ہے' اُس کے در پر آؤ تو صرف اُسی کا بندہ بن کر آؤ' ورنہ جزوی مسلمان کے لیے دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں دردناک عذاب کی وعید ہے۔ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو ''نفس کی بندگی'' معاشرے کے بندھنوں' شیطان اور اس کے اولیاء کی پیروی سے آزاد کر کے صبغۃ اللہ (اللہ کا رنگ) میں رنگ لو' کہ یہی رنگ اللہ کو پسند ہے اور یہی تقویٰ کا مظہر ہے۔

''وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ'' کی روشنی میں قانونی ایمان کے ''چراغِ راہ'' سے آگے بڑھ کر حقیقی ایمان کی ''منزل'' تک پہنچو۔ ایمانِ حقیقی کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ کسوٹی کا درجہ رکھتی ہے جو یقینِ قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ کو حقیقی ایمان کے دو لازمی اجزاء کے طور پر متعین کرتی ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یقین محکم ہی جہادِ زندگانی میں بدرجہ شمشیر' مردِ خدا کے لیے ''نقطۂ پرکارِ حق'' اور ''فتح یاب'' ہونے کی تمہید ہے۔ جس رب کو مانتے ہو' اُسی کی منوانے' اُس کے کلمے کو سربلند کرنے اور ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵) ''اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت سے نوازا'' کے تقاضوں کو ادا کرنے کے لیے مال و متاع اور خون جگر پیش کرو۔ بقول اقبال ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!

سن رکھو! یہ دو شرائط ﴿فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ﴾ پوری کرتے رہو تو ربّ کائنات نہ صرف تمہاری دعائیں قبول فرمائے گا بلکہ تمہارا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوگا اور تم خود ''تقدیر الٰہی'' کا مصداق بن کر اسلام کے غلبہ و شوکت کی نوید بن جاؤ گے۔ ایسے مردانِ حر ہی ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ (البقرۃ) ''اور تاکہ تم شکر کرو'' کے تقاضوں کو ادا کرنے والے اور شکوہِ عید کے مستحق ہیں۔ بقول اقبال ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کار کشا' کارساز!

اور ؎

مؤمن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

اور ؎

شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں' لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حر کی تکبیریں!

حکمت و احکامِ صوم کے متصلاً بعد آٹھویں رکوع کا موضوع جہاد و قتال فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی تقویٰ کی پونجی رہبانیت کے لیے نہیں بلکہ میدانِ کارزار میں باطل سے پنجہ آزمائی اور حق کے

بول بالا کے لیے ہے‘ جس کی آخری منزل قرآن حکیم بایں الفاظ واضح کرتا ہے: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۹۳) ’’اوران سے قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے‘‘ معیت الٰہی کی خوشخبری ایسے ہی متقیوں کو دی گئی ہے‘ یعنی ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹۴﴾ ’’اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔‘‘

۵) سورۃ البقرۃ آیت ۱۸۸ کی روشنی میں ماہِ صیام کے حاصل تقویٰ کا اصل معیار اور کسوٹی اکلِ حلال پر قناعت کو قرار دیا گیا ہے۔ اگر رمضان کے بعد بھی معیشت میں سود‘ فریب‘ جھوٹ اور بدعہدی وغیرہ کو ترک نہیں کرتے تو رمضان کے روزوں کا حاصل بھوک پیاس کے علاوہ کچھ نہیں۔ دیکھو! روز قیامت قدم نہ ہل سکیں گے جب تک اس بات کا جواب نہ دے لو کہ مال کہاں سے کمایا تھا اور کہاں خرچ کیا تھا؟ اکل حرام تقویٰ کے منافی اور دعاؤں کی قبولیت میں رکاوٹ ہے۔ علم و حکمت اور اللہ سے محبت کا دارومدار رزق حلال پر ہے اور یہی سرِّ دین ہے۔ بقول اقبال ؎

علم و حکمت زاید از نانِ حلال
عشق و رقّت آید از نانِ حلال

اور ؎

سرِّ دیں‘ صدقِ مقال ‘ اکلِ حلال!

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے قول کی رو سے ایک ’’چھوٹا روزہ‘‘ ہے اور دوسرا ’’بڑا روزہ‘‘۔ چھوٹا روزہ‘ صبح صادق سے غروب آفتاب تک چند پابندیوں کا نام ہے جبکہ بڑا روزہ بلوغت سے زندگی کے آخری سانس تک اللہ کی کامل بندگی سے عبارت ہے۔ چھوٹا روزہ‘ پانی اور کھجور وغیرہ سے افطار ہوتا ہے جبکہ بڑا روزہ‘ روزِ محشر دیدارِ الٰہی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے رسول کریم ﷺ کے ہاتھوں آبِ کوثر سے افطار ہوگا۔ اللہ ربّ العزت سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں چھوٹے روزے سے بڑے روزے کی طرف پیش قدمی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ۞۞۞

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

جہنم اور جہنمیوں کے احوال

قرآن حکیم کی روشنی میں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان کی دنیوی زندگی سراسر امتحان ہے۔ جس کسی نے اس زندگی میں خالقِ کائنات کی خوشنودی والے کام کیے اُس کو کامیاب قرار دیا جائے گا اور مرنے کے بعد ملنے والی دوسری ابدی زندگی اس قدر خوشحالی کی ہوگی کہ وہاں ہر طرح کی نعمتیں تو ہوں گی مگر کسی طرح کی بھی کوئی تکلیف اور مشقت نہ ہوگی۔ جنت میں جانے والا انسان وہ آرام و آسائش اور سدا بہار زندگی پائے گا جس کا حال بیان کرنا ناممکن ہے۔ مگر جو شخص دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور گناہوں کے ساتھ گزارتا ہے وہ فیصلے کے دن ناکام قرار دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے گا اور اسے جہنم میں ڈالا جائے گا جو عذابوں کا گھر ہوگا۔ عذاب ایسے کہ ان کی تکلیف اور اذیت برداشت کے قابل نہ ہوگی۔ وہ اذیت دراصل خالق کائنات کے غصے کا مظہر ہوگی کہ اس انسان نے دنیوی زندگی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کیوں گزاری' حالانکہ اسے فطری طور پر اچھائی اور برائی میں تمیز بتا دی گئی تھی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث فرما کر انسان کی راہنمائی کا سامان بھی کر دیا تھا۔ عقل سلیم کے تحت انسان یہ تو جان چکا کہ دنیاوی زندگی کے بعد ایسا وقت بھی آنا چاہیے جہاں اچھے کام کرنے والوں کو ان کی نیکی کا انعام ملے اور برائیاں کرنے والے سزا پائیں' کیونکہ یہ مشاہدہ تو عام فہم ہے کہ یہاں نیکوں کو نیکیوں کا صلہ نہیں ملتا اور بدکرداروں کو سزا نہیں ملتی' بلکہ اکثر اوقات تو اس کے اُلٹ ہوتا ہے کہ نیک اور شریف انسان تو ظلم اور ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں اور بدکردار اور بدمعاش دندناتے پھرتے ہیں۔

انسان دنیا میں امتحان کے لیے آیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور سمجھ سے کام لے کر اچھے اعمال کرے اور بُرے کاموں سے بچتا رہے تاکہ آنے والی اَبدی زندگی میں جہنم کی

سزا پانے سے بچ جائے۔ جہنم سے بچنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ انسان اللہ کی توحید کا قائل ہو اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے' یعنی یہ تسلیم کرے کہ خالق کائنات ایک ہی ہے اور تمام انبیاء کے بعد آخری نبی محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں' جن پر اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا جو صراطِ مستقیم کی راہنمائی کرتا ہے۔ یہی مطلب ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا۔ اس کلمے کو دل و جان سے قبول کر کے انسان مسلم بنتا اور دین اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ دین اسلام ہی وہ سچا دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا کیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵﴾ (آل عمران) ''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ (آل عمران: ۱۹) ''دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہے''۔ گویا جو اسلام میں داخل نہیں ہوا وہ حقیقی خائب و خاسر ہے یعنی وہ تو جہنم کا ایندھن بنے گا اور اس میں ہمیشہ جلتا رہے گا۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نیک کام کرتے ہیں' سچ بولتے ہیں' ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں اور بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جن سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسے لوگ اگرچہ اسلام میں داخل نہیں ہوتے تاہم اپنے اخلاق اور کردار سے دوسروں کے لیے مفید ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ان کے نیک کاموں کا بدلہ دنیا میں ہی اچھی شہرت یا دنیاوی خوشحالی کی صورت میں دے دیا جاتا ہے' مگر یہ کام اَبدی زندگی میں ان کو فائدہ نہ دیں گے' کیونکہ وہ توحید اور رسالتِ محمدیؐ پر ایمان نہیں رکھتے۔ حالانکہ اُخروی نجات کے لیے توحید اور رسالت پر ایمان ہونا ضروری ہے۔

بعض مسلمان توحید اور رسالت کے تو قائل ہیں مگر وہ کام ایسے کرتے ہیں جو کلمہ طیبہ کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے' یا وہ مخلوقِ خدا پر ظلم کرتے ہیں' چوریاں کرتے' ڈاکے ڈالتے' انسانوں کو ناحق قتل کرتے ہیں' دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں' تو ایسے لوگ بھی سزا پائیں گے اگرچہ مسلمان ہی ہوں۔ صرف اسلام لانا کافی نہیں۔ قرآن مجید میں بار بار توحید و رسالت پر ایمان لانے کے ساتھ نیک اعمال کی بھی تاکید ہے۔ اور جو مسلمان اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور جرائم میں زندگی گزاریں گے وہ سزا پائیں گے۔ عبادات تو حقوق اللہ ہیں اور مخلوقِ خدا کے ساتھ بھلائی کرنا

حقوق العباد میں شامل ہے۔ قرآن مجید میں جہاں حقوق اللہ ادا کرنے کی تاکید ہے وہیں حقوق العباد کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ حقوق اللہ میں کوتاہی تو جس کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ چاہے گا معاف کر دے گا‘ مگر حقوق العباد اگر تلف کیے ہوں گے تو وہ اسی صورت میں معاف ہوں گے اگر حق دار معاف کرے مگر جب دوزخ سامنے نظر آ رہی ہوگی تو کون معاف کرے گا؟ وہاں تو ماں باپ بھی حقوق معاف نہیں کریں گے اور کسی طرح کی مدد نہیں کریں گے۔ جہنم ہے تو سزا مگر اس کی سنگینی کا کسی قدر احساس کرنے کے لیے یہ سمجھنا ہوگا کہ جہنم کی سزا کوئی عام سزا نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی قابل برداشت نہیں‘ کیونکہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا شدید ہوگی۔ البتہ یہ درست ہے کہ دین اسلام کے ماننے والوں کو ہمیشہ کی سزا نہیں ملے گی۔ گنہگار مسلمان کو جہنم میں ڈالا جائے گا اور وہاں وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں چلا جائے گا‘ مگر یہ تھوڑی سی سزا کیسی ہوگی؟ جہنم کی سزا کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جہنمیوں کی کھالیں شدتِ نار سے جل کر راکھ ہو جائیں گی تو ان کی کھالیں تبدیل کر دی جائیں گی تاکہ وہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔ (بحوالہ سورۃ النساء‘ آیت ۵۶)

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے۔ اُس رحمٰن و رحیم اور غفور و رحیم ذات کا اختیار مطلق ہے۔ وہ چاہے تو محض توحید و رسالت کا زبانی اقرار کرنے والوں کو ان کے جرائم کی سزا دیے بغیر جنت میں داخل کر دے۔ لیکن عمومی قاعدہ اور ضابطہ یہی ہے کہ انہیں بدعملی کی سزا بھگتنی پڑے گی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں رہیں گے۔

یہ فرق بھی ملحوظ رکھیں کہ دائرۂ اسلام سے باہر کے لوگوں کے تو بظاہر نیک اعمال تولے ہی نہیں جائیں گے یعنی وہ صفر شمار ہوں گے‘ البتہ صاحبِ ایمان گناہگاروں کے اعمال کے وزن تولے جائیں گے اور انہیں اپنے اچھے کاموں کا صلہ دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝۱۰۵ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۝۱۰۶﴾ (الکہف)

’’یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کے سامنے جانے سے انکار کیا تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور ہم قیامت کے دن ان کے لیے کچھ بھی وزن قائم

نہیں کریں گے۔ یہ ان کی سزا ہے یعنی جہنم‘ اس لیے کہ انہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں اور ہمارے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی۔‘‘

گناہگار مسلمانوں کے گناہ جو حقوق اللہ سے متعلق ہوں گے ان میں سے کچھ تو ان کی نیکیوں کی وجہ سے دنیا میں ہی معاف کر دیے جائیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود: ۱۱۴) ’’کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں‘‘۔ کچھ گناہوں کو کسی اور بنا پر معاف کر دیا جائے گا اور کچھ گناہ ایسے ہوں گے جن کی وجہ سے ایسے لوگوں کو دوزخ کی آگ میں ڈالا جائے گا‘ مگر توحید اور رسالت پر ایمان کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں کی سزا پا کر نجات پا جائیں گے۔ جہاں تک کسی دوست‘ رشتہ دار اور خونی رشتوں کا تعلق ہے وہ بھی روزِ جزا کام نہیں آئیں گے‘ حتیٰ کہ ماں باپ اور بیوی بچے بھی بات نہیں سنیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝۳۴ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝۳۵ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝۳۶ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝۳۷﴾ (عبس) ’’اُس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا‘ اور اپنی ماں اور باپ سے‘ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے‘ ہر شخص کو اُس روز ایک ہی فکر (دامن گیر) ہوگی جو اُسے بے پروا بنا دے گی۔‘‘

جو اہلِ ایمان ہیں ان کو اپنے گناہوں کی سزا پا کر نجات تو مل ہی جائے گی مگر دوزخ میں گزارا ہوا ایک لمحہ بھی قابلِ برداشت نہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ گناہوں سے توبہ کرے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں لگا رہے اور استغفار کرتا رہے۔ یہ ہرگز نہ سوچے کہ میں مسلمان ہونے کی وجہ سے بالآخر دوزخ سے نکال لیا جاؤں گا۔ ہاں دنیا کی زندگی میں اپنے گناہوں اور خطاؤں کی معافی کے لیے احکم الحاکمین سے گڑگڑا کر معافی مانگتا رہے۔

جہنم تو دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے توحید اور رسالت کا انکار کیا یا توحید کو تو مانا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو جھٹلایا یا رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا بھی اقرار کیا مگر آپؐ کو خاتم النبیین نہ مانا‘ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی ایسے شخص کو نبی مانا جس نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۸﴾ (سبا) ’’(اور اے محمد ﷺ) ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے

لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے‘ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے‘‘۔ لہٰذا نجات کے لیے بس ایک ہی راہ ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کے ساتھ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو مانے‘ نہ تو کسی دوسرے الٰہ کو تسلیم کرے اور نہ کسی مدعی نبوت کی نبوت کو مانے۔ قرآن مجید کو اللہ ربّ العزت کی طرف سے نازل کی گئی واحد آخری کتاب مانے اور رسول اللہ ﷺ کے بعد وحیٔ الٰہی کے بند ہونے کا یقین رکھے۔ قرآن حکیم خدائی تعلیمات پر مشتمل ضابطۂ حیات ہے‘ اب یہی انسانیت کے لیے راہنما ہے۔ اہلِ اسلام کا کلمہ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے‘ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کا اقرار اور اس کے تقاضوں کو ماننا اور ان پر عمل کرنا ہی نجات کا واحد راستہ ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾﴾ (التوبۃ)

’’اللہ نے منافق مَردوں اور منافق عورتوں اور کافروں سے آتش جہنم کا وعدہ کیا ہے جس میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے‘ وہی ان کے لائق ہے‘ اور اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے‘ اور ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب (تیار) ہے۔‘‘

اسی طرح کافروں اور منافقوں کو جہنم میں اکٹھا کر دیا جائے گا۔ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿١٤٠﴾﴾ (النساء)

’’بیشک اللہ منافقوں اور کافروں سب کو دوزخ میں اکٹھا کرنے والا ہے۔‘‘

مشرکین کے بارے میں تو خاص طور پر فرما دیا گیا کہ وہ خالص جہنمی ہیں‘ کیونکہ انہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود مان لیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا ﴿١١٦﴾﴾ (النساء)

’’اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے بخش دے گا‘ اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔‘‘

جس طرح کافروں اور مشرکوں کے لیے دوزخ ہے‘ اسی طرح اہل کتاب بھی دوزخ میں جائیں گے‘ کیونکہ ان میں سے اکثر توحید کے تو قائل ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار

کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿٦﴾﴾ (البیّنۃ)

’’بے شک جو لوگ کافر ہوئے اہلِ کتاب میں سے اور مشرک وہ دوزخ کی آگ میں (پڑیں گے اور) ہمیشہ رہیں گے۔ یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔‘‘

اسی طرح سورۃ النساء میں منافقین کے بارے میں مزید فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿١٤٥﴾﴾

’’کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے‘ اور تم ان کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے۔‘‘

دین اسلام کو قبول نہ کرنے والے تمام گروہ جہنم واصل ہوں گے‘ صرف اہلِ اسلام ہی ایسے ہوں گے جو جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ البتہ توحید و رسالت کے قائل ہونے کے باوجود اگر انہوں نے گناہ اور نافرمانیوں کے کام کیے تو اپنی کرتوتوں کی سزا بھی وہ پائیں گے۔ قرآن مجید میں جن گناہوں کی سزا کا ذکر ہے وہ ان مسلمانوں کے لیے ہے جن کے گناہ نہ بخشے جائیں گے اور وہ اپنے جرائم اور گناہوں کی سزا پائیں گے۔ مثلاً چور کی سزا ہے کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ یہ دنیا کی سزا ہے‘ اگر اس کو دنیا میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ ملی تو وہ قیامت میں سزا پائے گا۔ سوچیے کہ جب دنیا میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے تو آخرت میں اس کی سزا کس قدر سنگین ہوگی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٣٨﴾﴾ (المائدۃ)

’’اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے۔ اور اللہ زبردست (اور) صاحب حکمت ہے۔‘‘

اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٣٢﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’اور زنا کے قریب نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے‘‘۔ اسی طرح زانی اور زانیہ کی سزا کا ذکر ہے جو جرم ثابت ہونے پر دی جائے گی۔ دنیا میں زانی کے لیے یہ سزا ہے تو سوچیے کہ

آخرت میں اس کی سزا کتنی سخت ہوگی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝٢﴾ (النور)

''بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والے مرد (جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو) دونوں میں سے ہر ایک کو سو دُرّے مارو اور اگر اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو ان پر اللہ کی شریعت کی حد جاری کرتے ہوئے تمہیں ہرگز ترس نہ آئے اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت موجود ہو۔''

ان جرائم سے روکا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کا معاشرہ بے حیائی اور برائیوں کے کام سے دور رہے اور پرامن ماحول وجود میں آئے۔

اسی طرح مال و دولت جمع کرنے اور گن گن کر رکھنے سے روکا گیا ہے۔ زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ دولت مند اپنی دولت ناداروں اور مفلسوں پر خرچ کریں۔ اور جو دولت کو جمع کر کے رکھیں اور مستحق لوگوں پر خرچ نہ کریں وہ دوزخ میں پڑ کر سزا پائیں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝٣٥﴾ (التوبة)

''جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا' پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا' سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزا چکھو۔''

انسانی جان لینا جرمِ عظیم ہے' کیونکہ زندگی دینا اور زندگی ختم کرنا خالق کا کام ہے۔ یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا دوزخ کے عذاب کو دعوت دینا ہے۔ قرآن مجید میں قاتل کو دوزخ کی سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝٩٣﴾ (النساء)

''جو شخص کسی مسلمان کو قصداً مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور ایسے شخص کے لیے اس نے بڑا (سخت) عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

انسان کا قتل اس قدر سنگین جرم ہے کہ اگر غلطی سے بھی کسی کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو وہ بھی معاف نہیں' بلکہ ایسا شخص قتلِ خطا کا مرتکب ہے اور اسے خون بہا دینا ہوگا۔

کوئی شخص فوت ہو جائے تو وہ جو کچھ چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔ ہر وارث کا حصہ بھی قرآن میں بتا دیا گیا ہے۔ وراثت کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ بہرحال وارثوں کو حصے کے مطابق تقسیم ہوگا۔ قرآن مجید میں وراثت کا قانون واضح کرنے کے بعد فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝١٤﴾ (النساء)

''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے نکل جائے گا اللہ اس کو دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا' اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا۔''

وراثت کی باضابطہ تقسیم نہ کرنے والوں کو دوزخ کی سزا کا مستوجب بتایا گیا ہے۔ اس جرم کی سزا کس قدر خوفناک ہے۔ کیا اس قرآنی وعید کے بعد لڑکیوں کو وراثت سے محروم کرنے کا کوئی عذر بنتا ہے؟ مختلف حیلوں سے اس ضابطے کو توڑنا دوزخ کی سزا کا موجب ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ ساری سزائیں مسلمانوں کے لیے ہیں یا اسلامی سلطنت میں رہنے والے غیر مسلموں کے لیے۔ عاقبت میں تو دو ہی مقام ہیں' یا جنت یا دوزخ۔ وہ مسلمان جو نافرمانی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کو جان لینا چاہیے کہ اگر ان کے اعمال اللہ اور اس کے رسولؐ کو ناراض کرتے ہیں تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہی ہوگا' کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ عاقبت میں کوڑوں اور ڈنڈوں کی سزا تو ہوگی نہیں' وہاں تو بس دوزخ ہی ہوگی۔

یہ تو چند گناہوں کا ذکر ہوا۔ شیطان اولادِ آدم کا ازلی دشمن ہے' اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو بہکائے اور انہیں قرآنی ہدایات سے روکے تاکہ وہ سزا پائیں۔ ہر شخص کو شیطان کے حملوں سے بچنے کے لیے اسلامی تعلیمات کو جاننا اور پھر ان پر عمل کرنا ضروری ہے' ورنہ شیطان تو بُرے کاموں کو مزین کر کے دکھاتا ہے۔ مثلاً وہ ترغیب دیتا ہے کہ اپنے مال کو سود پر دے دو تو تمہیں کتنا فائدہ ہوگا' حالانکہ سود حرام ہے۔ اسی طرح شیطان فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے روکتا

ہے‘ جب کہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۷۶) ’’اللہ سود کو نابود (یعنی بے برکت) کرتا ہے اور خیرات (کی برکت) کو بڑھاتا ہے‘‘۔ لہٰذا ہر مسلمان کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ اپنا لشکر بڑا کرے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا نافرمان بنا کر اپنے ساتھ دوزخ میں لے جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُورًا ﴿٦٣﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’اللہ نے (شیطان کو) کہا: دفع ہو جا‘ پس جو کوئی ان میں سے تیری پیروی کرے گا تو تم سب کی سزا جہنم ہے جو پورا پورا بدلہ ہے‘‘۔ پھر فرمایا: ﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿٦٥﴾﴾ (بنی اسرائیل) ’’جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تیرا کچھ زور نہیں۔ اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کا پروردگار کارسازی کے لیے کافی ہے۔‘‘

جہنم بدکرداروں کے انجام کی جگہ ہے‘ جس سے بری جگہ تصور بھی نہیں کی جا سکتی۔ غیر مسلم تو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ جہنم کو قرآن مجید میں بِئْسَ الْمِهَاد اور بِئْسَ الْقَرَار کہا گیا ہے۔ یعنی یہ برا ٹھکانہ ہے۔ جہنم بدترین جگہ ہوگی۔ جہاں آگ ہوگی اور ہر طرح کا عذاب ہوگا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ﴿٧﴾ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾﴾ (الھمزۃ)

’’وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے‘ جو دلوں پر جا لپٹے گی۔ (اور) وہ اس میں بند کر دیے جائیں گے (یعنی آگ کے) لمبے لمبے ستونوں میں۔‘‘

جہنم وہ جگہ ہے کہ اس سے زیادہ تکلیف دہ مقام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ النبا میں فرمایا:

﴿إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿٢١﴾ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿٢٢﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ أَحْقَابًا ﴿٢٣﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿٢٤﴾ إِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿٢٥﴾ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾﴾

’’بے شک دوزخ گھات میں ہے۔ سرکشوں کا وہی ٹھکانہ ہے‘ اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ وہاں نہ ٹھنڈک کا مزا چکھیں گے نہ (کچھ) پینا (نصیب ہوگا) سوائے گرم

پانی اور بہتی پیپ کے۔ یہ بدلہ ہے پورا پورا۔‘‘

سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا:

﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ أُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ أَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾﴾

’’یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے وبال میں ہلاکت میں ڈالے گئے‘ ان کے پینے کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دکھ دینے والا عذاب ہے‘ اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔‘‘

سورۃ المؤمن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوْٓا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ إِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿٥٠﴾﴾

’’اور کہیں گے وہ لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنم کے داروغوں (فرشتوں) سے‘ آپ اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ ہم سے بس ایک دن ہی عذاب میں تخفیف کر دے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آتے رہے تھے واضح نشانیوں (اور واضح تعلیمات) کے ساتھ؟ وہ کہیں گے: ہاں (آئے تو تھے)! وہ کہیں گے: تو اب تم خود ہی پکارو! اور کافروں کی دعا نہیں ہے مگر بھٹک کر رہ جانے والی۔‘‘

دنیا میں تنگی‘ تکلیف‘ بیماری یا کوئی اور پریشانی آتی ہے تو اس سے رہائی کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔ اگر وہ مصیبت کسی طرح دور نہ ہو تو موت آ کر ہر طرح کے دکھ مٹا دیتی ہے۔ دوزخی بھی چاہیں گے کہ جس طرح دنیا کی تکلیف اور مصیبت موت آنے پر ختم ہو جاتی ہے اسی طرح انہیں موت ہی آ جائے‘ مگر موت نہیں آئے گی‘ وہ بدستور دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿إِذَا رَأَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ﴿١٢﴾ وَإِذَآ أُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿١٣﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿١٤﴾﴾ (الفرقان)

’’جس وقت وہ (جہنم) ان کو دور سے دیکھے گی (تو غضب ناک ہو رہی ہوگی اور) یہ اس کے جوش اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔ اور جب یہ دوزخ کی کسی تنگ جگہ میں (زنجیروں

میں) جکڑ کر ڈالے جائیں گے تو وہاں موت کو پکاریں گے۔ (تو انہیں کہا جائے گا) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو، بہت سی موتوں کو پکارو!''

کیونکہ ان کو موت کسی صورت نہ آئے گی۔ سورۂ فاطر میں ہے:

﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا ۚ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ ﴿٣٧﴾﴾

''وہ اس میں چلائیں گے کہ اے پروردگار! ہم کو نکال لے (اب) ہم نیک عمل کیا کریں گے وہ نہیں جو پہلے کرتے تھے۔ (ان کو جواب ملے گا) کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ اس میں جو سوچنا چاہتا سوچ لیتا اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی آیا تھا' تو اب مزے چکھو' ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

ہر انسان کی فطرت میں اچھائی برائی کا امتیاز رکھ دیا گیا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿٨﴾﴾ (الشمس) ''پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری کرنے کی سمجھ دی''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے پاس پیغمبر بھیجے جنہوں نے اللہ کی خوشنودی والے اور اس کی ناراضگی والے کام بتا دیے۔ آج وہ تعلیم قرآن کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کو چھوڑ کر دُنیاوی نفع ہی پیش نظر رکھا جائے اور خدائی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا جائے تو یہ خالقِ کائنات کی نافرمانی ہے اور اس کی پاداش میں اگلی زندگی میں جہنم ملے گی۔ اس لیے کہ گناہوں کو بخش دینا اور نافرمانیوں کی سزا دینا صرف اللہ تعالیٰ کی چاہت پر ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا: ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾﴾ (البقرۃ) ''پس وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا' اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

چنانچہ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی والے کام کرے اور گناہ کے کاموں سے باز رہے وہیں کثرت سے استغفار کرتا رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جہنم کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھے اور جنت کے بیش بہا انعامات سے نوازے۔ آمین!

❁❁❁

عوام کی بنیادی ضروریات کا اہتمام حکومت کی اوّلین ذمہ داری

ڈاکٹر حافظ محمد سعد اللہ

نبی اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں لوگوں کی ضروریات کا اہتمام کس طرح کیا جاتا تھا؟ اس کی تفصیلات میں جانے سے قبل مناسب ہے کہ اختصار کے ساتھ یہ بھی معلوم کر لیا جائے کہ شرعاً بنیادی ضروریات کیا ہیں؟ ان کی مقدار کیا ہے؟ شریعتِ محمدیہ ﷺ میں ان کی کتنی اہمیت ہے؟ اور اس معاملے میں حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟ تو معلوم ہونا چاہیے کہ انسان کی بنیادی ضروریات زندگی یا فقہاء کی زبان میں حوائجِ اصلیہ (جن کے بغیر آدمی کا زیادہ دیر زندہ رہنا عام حالات میں مشکل ہوتا ہے) میں بالعموم چار چیزیں شمار کی جاتی ہیں‘ اور وہ ہیں: روٹی‘ پانی‘ لباس اور مکان۔

انہی کے ذیل میں چند اور متعلقہ چیزیں بھی فقہاء کے نزدیک حوائج اصلیہ میں داخل ہیں‘ مثلاً علاج معالجہ وطبیب کا معاوضہ‘ دوا کی قیمت‘ بیمار کے لیے خادم‘ کھانے پینے کے برتن‘ چولہا‘ گیس‘ ایندھن‘ جوتے‘ سردی اور گرمی میں کپڑوں کا جوڑا‘ سالن پکانے سے متعلقہ اشیاء‘ گھر کا ضروری سامان‘ چارپائیاں‘ موسم کے مطابق بستر وغیرہ‘ کام کاج کے لیے خادم‘ سواری‘ کاری گروں کے لیے ان کے فن کے آلات‘ روشنی کے لیے دیا‘ علماء کے مطالعہ کے لیے کتابیں وغیرہ۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ ایک انسان کے لیے بنیادی ضروریات زندگی کی کتنی مقدار درکار ہوتی ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی یعنی کھانا‘ پینا‘ کپڑا اور مکان وغیرہ کی کم از کم یا زیادہ سے زیادہ کسی متعین مقدار اور نوعیت پر کوئی نص نظر نہیں آتی۔ تاہم قرآن مجید نے بیویوں کے نفقہ اور دیگر احکام میں ’’بالمعروف‘‘ کا جامع لفظ استعمال کیا ہے۔ یعنی اس نفقہ (روزینہ یا خرچہ) کی جزئیات وتفصیلات..... علاقہ‘ برادری یا لوگوں کے عام شریفانہ عرف اور

دستور کے مطابق طے کی جائیں گی‘ جو کسی قاعدہ شرعی کے خلاف نہ ہوں۔

ایک حدیث شریف سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ ضروریات‘ حالات کی مناسبت سے اتنی مقدار میں لازم ہیں جتنی ایک آدمی کو بقدر ضرورت کافی ہو۔ جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ چنانچہ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ بارگاہ نبویؐ میں جب یہ شکایت کی کہ ان کا خاوند کنجوس آدمی ہے‘ وہ کھانے کو اتنا نہیں دیتا جو مجھے اور بچوں کے لیے کافی ہو‘ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((خُذِیْ مِنْ مَالِ اَبِیْ سُفْیَانَ مَا یَکْفِیْکِ وَوَلَدَکِ بِالْمَعْرُوْفِ))[1]

’’تم ابوسفیان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو تجھے اور تیرے بچوں کے لیے دستور کے مطابق کفایت کر جائے۔‘‘

الغرض ضروریات میں اصولی چیز احتیاج کا لحاظ رکھنا ہے۔ جس آدمی کی جتنی احتیاج اور ضرورت ہوگی‘ اتنی ہی مقدار اس کے لیے لازم ہوگی۔

حکومت کی ذمہ داری

اس معاملے میں حکومت کی ذمہ داری کیا ہے؟ اس سلسلہ میں نص کے تتبع سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے زیر اثر بسنے والا کوئی چھوٹا بڑا فرد‘ چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم (ذمی) جب زمین میں پھیلے ہوئے رزق الٰہی میں سے اپنے ہاتھ سے اور اپنے وسائل سے اپنی بنیادی ضروریات کو پورا نہ کر سکے اور نہ اسے اپنے اقرباء و دیگر باشندوں کی مالی امداد حاصل ہو‘ تو اسلام حکومت کو اس بات کا پابند بناتا اور اس کی ایک اہم ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ایسے ضرورت مند بندگانِ خدا کی بنیادی ضروریات کا اپنے حکومتی وسائل و اختیارات سے ازخود معقول بندوبست کرے۔ محروم المعیشت لوگوں کو اپنی ضروریات کے لیے سرکاری دفاتر کے چکر نہ لگانا پڑیں۔ کیونکہ افرادِ معاشرہ کو بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی حکومت کا ایک قسم کا فرض ہے۔ اس کے عوض وہ افراد سے کسی خدمت یا معاوضے کی طالب نہیں ہوتی۔

اسلام بنیادی ضروریات کی فراہمی سودے بازی کی بنیادوں پر نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں اسلام اور سوشلزم کے درمیان بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ سوشلزم بنیادی ضروریات فراہم کرتا ہے مگر افراد کی صلاحیت کار کی قیمت کے طور پر..... ان کو روٹی‘ کپڑا اور مکان مہیا کرتا ہے‘ مگر جانوروں

کی طرح ان سے دن رات کام لے کر..... اس کے بالمقابل اسلام افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات ان کا انسانی حق سمجھ کر فراہم کرتا ہے اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے صلاحیت کار کو جہاں چاہیں استعمال کریں اور پوری آزادی کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیں۔

اسلام میں حکمران (خلیفہ) یا حکومت (خلافت) فرمانروائے اعلیٰ (خداوند عرش) کی نمائندگی اور نیابت کا نام ہے:

اَلخِلافةُ نیابةٌ عَن صاحبِ الشَّرعِ فِی حِفظِ الدِّیْنِ وَ سیاسةِ الدُّنیا(۲)

''خلافت (حکومت) لوگوں کے دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست (دنیوی امور چلانے) میں (اللہ کریم کی) نیابت کا نام ہے۔''

ظاہر ہے کہ نائب یا قائم مقام یا خلیفہ کے فرائض اور ذمہ داریوں میں وہ تمام ذمہ داریاں شامل ہوں گی جو اس کا اصل یعنی خلیفہ بنانے والا سرانجام دیتا ہے۔ تو رب العالمین جس نے حکومت یا حکمران کو اپنا خلیفہ بنایا ہے' نے ازراہِ شفقت وکرم ایک بات یہ بھی اپنے ذمہ لے رکھی ہے کہ:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود:۶)

''اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا (جان دار) نہیں ہے' مگر (یہ کہ) اس کا رزق اللہ (کے ذمۂ کرم) پر ہے۔''

اس چیز کو نبی اکرم ﷺ نے ایک حدیث شریف میں یوں بیان فرمایا:

((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰهِ))(۳)

''تمام مخلوق اللہ کا عیال (کنبہ) ہے۔''

اور کسی کے ''عیال'' لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے' جن کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی ہے۔ تو جب ساری مخلوق اللہ کا کنبہ (عیال) قرار پائی اور ان کے نان ونفقہ یا ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہوئی' تو اللہ کے خلیفہ (حکومت) کی بھی ذمہ داری ہوگی کہ اس کی ریاست میں کوئی متنفس بھوکا پیاسا نہ رہے۔

مشہور حنفی فقیہہ سید علی زادہ نے امیر حکومت کے فرائض بتاتے ہوئے فرمایا کہ:

وَ لَا یَدَعُ فَقیرًا فِی ولایتِه اِلَّا اَعطاه و لَا مَدیُونًا اِلَّا قَضٰی عنه دَینَه وَلَا ضعیفًا اِلَّا اَعَانه و لَا مَظلُومًا اِلَّا نَصَرَه و لَا ظالِمًا اِلَّا مَنَعَه عَنِ

الظُّلم ولا عاریًا الا کسَاه کسوةً(۴)

''وہ اپنی مملکت کے اندر کوئی ایسا فقیر نہ چھوڑے جس کو عطا نہ کرے اور کوئی ایسا مقروض نہ چھوڑے جس کی طرف سے قرض کو ادا نہ کردے اور کوئی کمزور نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی مدد کردے اور کوئی مظلوم نہ چھوڑے مگر یہ کہ اس کی مدد کرے اور نہ کسی ظالم کو ظلم کرنے دے اور کوئی ننگا نہ چھوڑے' جس کو پہنا نہ دے''---

المختصر اسلامی نقطہ نگاہ سے دو باتیں انتہائی قابل لحاظ ہیں:

(۱) تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

(۲) تمام انسان اللہ کے نزدیک برابر ہیں۔ اب وہ اونچے طبقہ کے ہوں یا نیچے طبقے کے۔ اللہ ان کا پروردگار اور فرماں روا ہے اور وہ اس کے بندے اور رعایا ہیں۔

اسلامی حکومت معاشی زندگی کے دائرہ میں ان دو باتوں کا لحاظ رکھنے پر مامور ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے کنبے کا کوئی فرد کھانے' کپڑے اور مکان وغیرہ سے محروم نہ رہے' دوسرا یہ کہ اللہ کے بندوں میں سب کو انسانیت کے عام حقوق میں برابر کا سمجھا جائے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت اس کا خیال نہیں رکھے گی تو انسانیت کے بلند درجے سے گر جائے گی اور اخروی باز پرس میں ماخوذ ہوگی۔

خلفاء کا احساس ذمہ داری

غالباً اسی ذمہ داری کو مدِنظر رکھتے ہوئے امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

لَو مَاتتْ شَاةٌ عَلٰی شَطِّ الفُراتِ ضَائِعةً لَظَننتُ أنَّ اللّٰهَ تعَالٰی سائلِی عَنها یومَ القیامة(۵)

''اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے' تو میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے بارے میں مجھ سے جواب طلبی فرمائے گا''---

المختصر اسلام میں خلیفہ ان تمام لوگوں کی بنیادی ضروریات کا ذمہ دار اور کفیل ہے' جن کا معاشرے میں اور کوئی ذمہ دار یا کفیل نہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ مَولٰی مَن لَا وَلِیَّ لَه))(۶)

''اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہر اس آدمی کا مددگار یا سرپرست ہے جس کا کوئی ولی وارث نہ ہو''---

ایک حدیث میں فرمایا:

((اَلسُّلْطَانَ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَـهٗ)) (۷)

''بادشاہ (یا حکومت) ہر اس آدمی کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو''---

ایک حدیث میں ارشاد نبویؐ ہے:

((اَنَا وَلِیُّ مَن لا وَلِیَّ لَه)) (۸)

''میں ہر اس شخص کا ولی (سرپرست) ہوں، جس کا (اس دنیا میں) کوئی ولی نہیں''۔

ان احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں بالکل واضح ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہلِ حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ بعض بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے مگر حتی الامکان دوسری اہم ضروریات کی طرف بھی توجہ کی جانی چاہیے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''سلطان پر واجب ہے کہ جب اس کی رعایا تنگی میں مبتلا ہو اور فاقہ اور مصیبت سے دوچار ہو، تو ان کی مدد کرے۔ بالخصوص قحط اور گرانی کے زمانہ میں۔ کیونکہ ایسے حالات میں لوگ کسب معاش میں ناکام رہتے ہیں اور گزر اوقات کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں سلطان کو چاہیے کہ ان کو کھانا فراہم کرے اور ان کے خزانے سے انہیں مال دے کر ان کی حالت بہتر بنائے''(۹)

دورِ نبویؐ میں ضروریاتِ زندگی کا انتظام

بنیادی ضروریات کی فراہمی میں اسلامی حکومت (خلیفہ) کی اہم ذمہ داری کی قدرے وضاحت کے بعد اب اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ خود اسلامی حکومت کے بانی اور مؤسس اوّل نبی اکرم ﷺ نے اپنے وسائل کے اندر کس خوب صورتی سے ضرورت مند لوگوں کی بنیادی ضروریات کا انتظام فرمایا۔

(۱) رہائش وخوراک کا بندوبست: نبی اکرم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے اور یہاں چھوٹی اور محدود سی اسلامی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا گیا تو ایک انتہائی اہم اور فوری حل طلب مسئلہ جو آپ ﷺ کو درپیش آیا، وہ ان مہاجرین گھرانوں کی رہائش وخوراک کا تھا، جو اللہ و رسول (جل جلالہ وﷺ) کے ساتھ بے مثال وفا کا مظاہرہ کرتے ہوئے دین و ایمان کی خاطر اپنے گھر بار، کاروبار، منقولہ وغیر منقولہ جائیدادیں چھوڑ کر مکہ سے

مدینہ منورہ آ گئے تھے۔

ادھر حکومت کے پاس ابھی اتنے وسائل نہیں تھے کہ سرکاری طور پر ان مہاجرین کی آبادکاری، رہائش اور کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا۔ اس کے باوجود اس نوزائیدہ اسلامی حکومت کے حکمران اوّل (ﷺ) گھبرائے نہیں، مہاجرین کو اپنے حال پر یا کسی کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا، بلکہ آپ ﷺ نے اس اہم، پیچیدہ اور وسائل طلب مسئلے کو ایسی فراست، دور اندیشی، عقل مندی اور اتنی خوب صورتی سے سلجھایا کہ دنیا آج تک محوِ حیرت ہے۔ وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ میں پہلے سے رہنے والے مسلمانوں، جنھیں قرآن ''انصار'' کے خوبصورت لقب سے یاد کرتا ہے اور مہاجرین کے درمیان باہمی ہمدردی وغم خواری کا ''عقد مواخاۃ'' قائم فرما کر مہاجرین کی آبادکاری کے مسئلے کو یوں حل فرما دیا کہ یہ مسئلہ اب کوئی مسئلہ ہی نہ رہا۔ انصار نے اپنے مہاجر اسلامی بھائیوں کے لیے ایسی محبت، ایثار اور اخوت کا مظاہرہ کیا کہ دنیا نے آج تک سگے بھائیوں کے درمیان بھی ایسی محبت واخوت نہیں دیکھی ہوگی۔

انصار زراعت پیشہ، زمین دار اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے، ہر صاحب زمین جانتا ہے کہ انسان اپنی زمین اور باغات سے کتنی محبت رکھتا ہے۔ مگر میرے خیال میں اس وقت فرشتے بھی ورطہ حیرت میں پڑ گئے ہوں گے جب ایثار پیشہ انصار نے حضور اکرم ﷺ کو اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے یہ پیشکش کی کہ:

اقْسِمْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ إِخْوَانِنَا النَّخِيلَ (۱۰)

''آپ ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان ان باغات کو (برابر برابر) تقسیم فرما دیں''---

مگر آپ ﷺ نے ان کی اس مخلصانہ پیش کش اور تجویز سے اتفاق نہ فرمایا، کیونکہ کسی مخلص بھائی کو اس کی پونجی سے محروم کر دینا اور اس پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالنا بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ اب انصار نے یہ تجویز پیش کی کہ پھر مہاجرین کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ہم انہیں پیداوار میں شریک کر لیں گے۔ غیور مہاجرین نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور یوں وہ ایک دوسرے کے شریک کار بن گئے۔

انصار کی طرف سے یہ پیشکش صرف زمینوں اور باغات میں نہیں تھی، بلکہ وہ عقد مواخات کے بعد مہاجر بھائیوں کو اپنے گھروں میں لے گئے اور اپنا سارا اثاثہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ

گھر میں جو کچھ ہے وہ آدھا تمہارا اور آدھا ہمارا ہے۔ حتیٰ کہ جس انصار کے پاس دو بیویاں تھیں‘ اس نے مہاجر بھائی کو ایک بیوی کی بھی پیش کش کر دی‘ کہ جس کو چاہو‘ میں اسے طلاق دے دیتا ہوں۔(۱۱)

المختصر یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے مہاجرین کی خوراک‘ روزگار‘ رہائش اور آبادکاری کا ہنگامی طور پر انتظام فرما دیا۔ انصار میں جن کے ایک سے زیادہ مکانات تھے‘ انہوں نے وہ مہاجرین کو دے دیے‘ مگر کچھ مدت بعد مہاجرین اپنے مکانوں اور جھونپڑوں میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکانات اور جھونپڑے ان قطائع (پلاٹوں) پر بنائے گئے تھے جو رسول اکرم ﷺ نے انہیں انصار مدینہ کی موہوبہ اراضی یا افتادہ زمینوں سے عطا کیے تھے۔

(۲) مدینہ میں مسلمانوں کے لیے پانی کا انتظام: پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور مہاجرین مدینہ منورہ میں ہجرت کر کے آئے تو اس وقت جو اہم مسائل سامنے آئے‘ ان میں ایک مسئلہ پانی کا بھی تھا۔ پورے شہر میں بیر رومہ کے سوا کوئی میٹھا پانی نہ تھا۔ صرف یہی پینے کے لائق تھا مگر اس کا مالک ایک یہودی تھا۔ اس نے اس خداداد نعمت کو ذریعہ معاش بنا رکھا تھا اور لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتا تھا۔ حضور ﷺ کے پاس ابھی تک حکومتی وسائل تو تھے نہیں‘ اس لیے آپؐ نے مخیر حضرات کو مسلمانوں کے لیے اس کی خریداری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ:

”جو آدمی اس کنویں کو خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دے گا اللہ کریم اسے جنت میں اس سے کہیں بہتر کنواں عنایت فرمائے گا“۔(۱۲)

یہ سعادت حضرت سیدنا عثمان غنی ؓ کی قسمت میں لکھی تھی‘ وہ سارے کنویں کو خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دینے پر تیار ہو گئے‘ مگر کنویں کا مالک صرف نصف حصہ فروخت کرنے پر رضامند ہوا۔ حضرت عثمان ؓ نے بارہ ہزار درہم کے عوض نصف کنواں خرید لیا اور شرط یہ قرار پائی کہ ایک دن حضرت عثمان ؓ کی باری ہوگی اور دوسرے دن اس یہودی کے لیے کنواں مخصوص رہے گا۔ جس روز حضرت عثمان ؓ کی باری ہوتی تھی اس روز مسلمان اس قدر پانی بھر کر رکھ لیتے کہ دو دن تک کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہودی نے دیکھا کہ اب اس سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا تو وہ بقیہ نصف بھی فروخت کرنے پر راضی ہو گیا۔ حضرت عثمان ؓ نے باقی نصف بھی آٹھ ہزار درہم میں

خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا اور یوں سارے مسلمانوں کے لیے میٹھے پانی کا انتظام ہو گیا۔(۱۳)

(۳) بے کسوں کی کفالت کا عام اعلان: سورۃ الاحزاب کی آیت ۶ ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ کے تحت علامہ آلوسی ؒ نے ”روح المعانی“ میں اور قرطبی نے ”الجامع لاحکام القرآن“ میں بخاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب فتوحات ہونے لگیں اور بیت المال میں مال غنیمت آنے لگا تو نبی اکرم ﷺ نے مذکورہ آیت کا حوالہ دیتے ہوئے اعلان عام فرمایا:

((فَاَيُّمَا مُؤْمِنٍ مَاتَ وَ تَرَكَ مَالًا فَلْيَرِثْهُ عَصَبَتُهُ مَنْ كَانُوْا ‘ وَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا ‘ اَوْ ضَيَاعًا فَلْيَأْتِنِي فَاَنَا مَوْلَاهُ)) (۱۴)

”جو مؤمن بھی مال چھوڑ کر مرے گا اس کے وارث اس کے عصبہ (قریبی رشتہ دار) ہوں گے اور اگر وہ اپنے ذمہ دَین (قرض) چھوڑ کر مرا‘ یا بچے (جن کے پاس کچھ بھی نہ ہو) چھوڑ کر مرا‘ تو وہ قرض اور یتیم بچے میرے ذمہ ہیں اور میں ہی ان کا والی ہوں گا‘ یعنی ان کی کفالت کروں گا اور ان پر مال خرچ کروں گا“---

صحیفہ ہمام بن منبہ کے الفاظ ہیں:

((فَاَيُّكُمْ مَا تَرَكَ دَيْنًا اَوْ ضَيْعَةً فَادْعُوْنِيْ فَاِنِّيْ وَلِيُّهُ))(۱۵)

”تم میں سے جو آدمی قرض یا چھوٹے بچے چھوڑ کر مر جائے تو مجھے بلاؤ (اطلاع کرو) بے شک قرض اور بچوں کے معاملے میں۔ میں اس کا ولی ہوں (اور اگر مال چھوڑ کر مرا ہے تو وہ اس کے قریبی رشتہ داروں کا ہے)“---

حضور ﷺ کا یہ اعلان آج کے کسی مطلب پرست‘ خودغرض‘ ابن الوقت اور مصنوعی خیر خواہ سیاست دان کا نہ تھا‘ جو ووٹ کی خاطر دورانِ الیکشن طرح طرح کے سبز باغ دکھاتا اور پرکشش وعدے اور اعلان کرتا ہے۔ جب غریب کے ووٹ سے اسمبلی میں پہنچ جاتا ہے تو اس کے بعد اس منافق اور مفاد پرست کی حالت کچھ یوں ہوتی ہے کہ تو کون اور میں کون۔ مندرجہ بالا اعلان یا بیان اس لج پال‘ غریب نواز اور یتیم پرور وغریب پرور رسول ﷺ کا تھا جو زبانی دعووں کے نہیں بلکہ عمل اور صرف عمل کے قائل تھے۔ وہ ایک فی صد کہتے تھے اور صد فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ اس پر عمل کرتے تھے۔

اللہ کریم نے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین اور رءوف و رحیم بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔ مخلوقِ خدا کی ہمدردی، غم گساری، خیر خواہی اور شفقت و رحمت آپ ﷺ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ آپ ﷺ ضرورت مندوں، محتاجوں، غریبوں، مسکینوں، کمزوروں اور بھوکوں کی معاشی فلاح کا کوئی انتظام نہ فرماتے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتی غم خواری اور دردمندی کا یہ عالَم تھا کہ جب تک بھوکے کو کھانا کھلا نہ لیتے..... ننگے کو کپڑا مہیا فرما نہ لیتے..... مصیبت زدہ کی مصیبت دور فرما نہ لیتے..... پریشان حال کی پریشانی کا علاج فرما نہ لیتے..... ضرورت مند کی ضرورت پوری فرما نہ لیتے..... محتاج کی احتیاج کی بندوبست فرما نہ لیتے..... مشکل میں پھنسے ہوئے کو مشکل سے نکال نہ لیتے..... درد سے کراہنے والوں کو چپ کرا نہ لیتے..... مظلوم کو ظلم سے نجات دلوا نہ لیتے..... خوف زدوں کے خوف کو دور فرما نہ لیتے..... مقروض لوگوں کی ادائیگیٔ قرض کا کوئی انتظام فرما نہ لیتے..... یتامیٰ اور بیوگان کی دیکھ بھال کی کوئی صورت پیدا فرما نہ لیتے..... نہ کما سکنے والوں کی زیست کی کوئی شکل نہ بنا لیتے..... اس وقت تک آپ ﷺ کی ذات گرامی کو چین نہ آتا۔ یہ محض لفّاظی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ حضور ﷺ کی اس شفقت علی الخلق اور انسانیت کے ساتھ ہمدردی و غم خواری کے طبعی جذبہ کی طرف قرآن حکیم نے یوں اشارہ کیا ہے:

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٨﴾﴾

(التوبۃ)

''(اے لوگو!) وہ تمہارے لیے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں (اور) مؤمنوں کے لیے نہایت (ہی) شفیق، بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔''

دکھ تمہیں ہوتا ہے، مصیبت میں تم مبتلا ہوتے ہو، درد تمہیں ہوتا ہے، مگر اس درد کی ٹیس وہ محسوس کرتے ہیں۔

آپ ﷺ نے کبھی بھی محض وعظ و نصیحت اور غریبوں، کمزوروں، بھوکوں اور مظلوموں کے حق میں زوردار تقریر پر اکتفا نہیں کیا، صرف زبانی الفاظ اور جھوٹ موٹ کے ٹسوؤں سے غریب لوگوں کو کبھی بہلانے کی کوشش نہ فرمائی، کیونکہ تقریر سے کسی بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا کرتا اور نہ ہی تقریر سے مصیبت زدہ اور مظلوم کی دادرسی ہوا کرتی ہے، اس لیے آپ ہمیشہ زبان سے زیادہ عمل کے ذریعے غرباء و مساکین کی ہر طرح سے امداد، ہمدردی، غم خواری اور دل داری فرماتے رہے۔

اعلانِ نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ کی یہ عادت کریمہ تھی اور اس کے بعد بھی ساری زندگی یہی معمول رہا۔

(۴) دورِ نبوی ﷺ کی عام مالی پالیسی: عہد نبوت ﷺ میں مالیات سے متعلق عام طور پر حضور اکرم ﷺ کی ذاتی اور سرکاری پالیسی یہی نظر آتی ہے کہ جو کچھ آتا جب تک فوری طور پر ضرورت مندوں اور حق داروں میں تقسیم نہ کر دیا جاتا، اس وقت تک آپ ﷺ کو چین نہ آتا۔ اس چیز کی تائید خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی صحیح بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ:

''بحرین سے خراج اور جزیے کا مال بارگاہ نبویؐ میں پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس مال کو مسجد (کے صحن) میں پھیلا دو۔ بقول راوی حضور ﷺ کے پاس جتنے بھی اموال آئے، ان میں یہ سب سے زیادہ تھا۔ (محدثین نے ایک لاکھ درہم کا اندازہ لگایا ہے) جب آپ ﷺ نماز کے لیے باہر تشریف لائے تو (اپنی طبعی سیر چشمی اور غنائے نفس کی وجہ سے) مال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جب نماز ہو چکی تو آپ ﷺ مال کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ پس جو بھی نظر آتا، اسے (اس کی ضرورت کے مطابق) عنایت فرما دیتے۔ چنانچہ آپ ﷺ اس وقت تک وہاں سے نہ اٹھے جب تک کہ سارا مال تقسیم نہ ہو گیا اور ایک درہم بھی باقی نہ بچا''---

ایک دوسری روایت میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''خوب جانتی ہوں کہ حضور ﷺ کے وصال تک کی مبارک زندگی میں (آپؐ کے گھر میں) سب سے زیادہ مال کب آیا؟ ایک مرتبہ رات کے پہلے حصے میں آپؐ کے پاس ایک تھیلی آئی، جس میں آٹھ سو درہم اور ایک پارچہ تھا، وہ تھیلی آپؐ نے میرے پاس بھیج دی، اس رات میری باری تھی۔ آپؐ عشاء کے بعد گھر واپس تشریف لائے اور حجرہ شریف میں اپنی نماز کی جگہ میں نماز شروع کر دی۔ میں نے آپؐ کے لیے اور اپنے لیے بستر بچھایا ہوا تھا۔ میں آپؐ کا انتظار کرنے لگی لیکن آپؐ بہت دیر تک نماز پڑھتے رہے۔ نماز کے بعد آپؐ اپنی نماز کی جگہ سے باہر تشریف لائے اور پھر وہیں واپس چلے گئے اور نماز شروع کر دی۔ اس طرح بار بار فرماتے رہے، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ آپؐ نے مسجد میں جا کر نماز پڑھائی اور پھر واپس تشریف لائے اور فرمایا: وہ تھیلی کہاں ہے، جس نے آج ساری رات مجھے پریشان کیے رکھا؟ چنانچہ تھیلی منگوائی اور

اس میں جو کچھ تھا وہ سب تقسیم فرما دیا۔‘‘(۱۶)

(۵) حکومت نبویؐ میں عطاء و بخشش کا معیار: عام سلطنتوں میں محاصل کے حق دار وہی لوگ ٹھہرتے جو بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتے‘ یا عیش پسند امراء ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ دولت مندوں کی دولت مندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ لیکن حضور نبی اکرم ﷺ نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا‘ اس میں دولت مندی اور تقرب نہیں بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا‘ کیونکہ کمزوروں کا حق طاقت وروں کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا۔

سلطنت کی آمدنی اور محاصل کو دیگر بادشاہوں کے برعکس آپ ﷺ امانت تصور فرماتے اور عام مسلمانوں کی ضرورت میں خرچ فرماتے۔ زکوٰۃ‘ صدقہ‘ خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا‘ وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب حضور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ میں آتا تھا لیکن آپؐ نے اس کو اپنی نہیں بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا أُوتِيكُمْ مِنْ شَيْءٍ وَ مَا أَمْنَعُكُمُوْهُ إِنْ أَنَا إِلَّا خَازِنٌ أَضَعُ حَيْثُ أُمِرْتُ))(۱۷)

’’میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں‘ میں صرف خزانچی ہوں‘ جس موقع پر صَرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے‘ وہاں صَرف کرتا ہوں‘‘---

دوسرے موقع پر فرمایا:

((إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَ خَازِنٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ(۱۸)

’’میں تو صرف بانٹنے والا ہوں‘ دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے‘‘---

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خُمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح کی ہے کہ خُمس کے پانچ حصے کیے جاتے تھے۔ ایک اللہ و رسول (جل جلالہ وﷺ) کے لیے‘ دوسرا قرابت داروں کے لیے‘ تیسرا یتیموں کے لیے‘ چوتھا مسکینوں کے لیے اور پانچواں مسافروں کے لیے ہوتا تھا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں خمس کا جو پانچواں حصہ آتا تھا‘ آپؐ اس کو بھی تین حصوں میں بانٹ دیتے تھے‘ یعنی

(۱) اللہ کی راہ میں خرچ فرما دیتے تھے‘ (۲) قوم میں حضور ﷺ کا جو نائب ہوتا تھا اس کو بھی اس میں سے دیتے تھے‘ (۳) پھر جب مال زیادہ ہو گیا تو یتیموں‘ مسکینوں اور مسافروں کو بھی دینے لگے۔

ان تحصیلات کی روشنی میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا کہ:

((لَيْسَ لِيْ مِنْ هٰذَا الْفَيْءِ إِلَّا الْخُمُسَ وَ الْخُمُسُ مَرْدُوْدٌ فِيْكُمْ))

’’تمہارے مال غنیمت میں سے میرے لیے صرف پانچواں حصہ اور یہ بھی تمہیں لوگوں پر لوٹا دیا جاتا ہے (یعنی تقسیم کر دیا جاتا ہے)‘‘---

(۶) رعایا کی ضروریات پوری کرنے کا عام اسلوب: عہد نبویؐ میں باقاعدہ وزارتیں اور مختلف محکمے وجود میں نہیں آئے تھے‘ اس لیے ہر سائل براہ راست بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوتا اور اپنی حاجت پیش کرتا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

’’جب حضور اکرم ﷺ کے پاس کوئی مسلمان آدمی آتا اور اسے ننگا (یا بھوکا) دیکھتے‘ تو مجھے اس کے لیے کپڑے مہیا کرنے کا حکم فرماتے۔ میں جا کر قرض لیتا‘ اس کے لیے کپڑے اور متعلقہ چیزیں خریدتا‘ اسے کپڑے پہناتا اور کھانا کھلاتا۔‘‘(۱۹)

اسلام نے اس چیز کو ایمان کے ہی منافی قرار دیا ہے کہ ایک آدمی خود تو خوب سیر ہو کر کھالے اور اس کے پڑوس میں رہنے والا رات بھوکے ہی بسر کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يَشْبَعُ وَ جَارُهٗ جَائِعٌ إِلٰى جَنْبِهٖ))(۲۰)

’’وہ شخص کامل مومن نہیں جو خود تو سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا پڑا ہو‘‘---

ایک حدیث میں فرمایا:

((وَأَيُّمَا أَهْلُ عَرْصَةٍ أَصْبَحَ فِيْهِمْ امْرُؤٌ جَائِعٌ فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللّٰهِ تَعَالٰى))(۲۱)

’’جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ رات بھر بھوکا رہا تو اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم‘‘---

انسان جس طرح کا کھانا خود کھائے‘ پہنے‘ ایمان کا مطالبہ ہے کہ اسی طرح کا کھانا پینا اور پہنانا اپنے

ماتحت ان لوگوں کو بھی دے جو بنیادی ضروریات سے محروم ہیں۔ حضور ﷺ کی ذاتی طبیعت، فطرت اور جبلت تو یہ تھی کہ سب کچھ خرچ کرنے پر حسرت افسوس کی بجائے اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک کہ خرچ نہ کرلیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ جبلی جود وکرم کے باعث ''لا'' (نہیں) کا لفظ آپؐ کی ڈکشنری میں ہی نہیں تھا۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے:

مَا سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ عَنْ شَیْءٍ قَطُّ فَقَالَ لَا(۲۲)

''نبی اکرم ﷺ سے کبھی کسی ایسی چیز کا سوال نہیں کیا گیا جس کے جواب میں آپ ﷺ نے ''نہیں'' فرمایا ہو''---

نبی اکرم ﷺ کو لوگوں کی ضروریات کا کتنا احساس تھا، اس کی ایک جھلک درج ذیل روایت میں دیکھیے:

حضرت عمر بن الخطاب ؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک ضرورت مند آدمی حضور ﷺ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ آپؐ اسے کچھ عنایت فرمائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس وقت تو میرے پاس کوئی چیز نہیں، البتہ جو کچھ لینا چاہتے ہو میرے نام پر خرید لو، جب میرے پاس کوئی چیز آجائے گی تو میں ادائیگی کردوں گا''---حضرت عمر ؓ جو پاس ہی بیٹھے تھے، نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ جس چیز پر قدرت نہیں رکھتے یا جو چیز آپؐ کے پاس نہیں ہے، اللہ نے جب اس کا آپؐ کو مکلف نہیں کیا تو آپؐ خواہ مخواہ کیوں تکلیف فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے حضرت عمر ؓ کی اس بات یا مشورے کو پسند نہ فرمایا۔ ایک انصاری نے حضور ﷺ کی اس ناگواری کو دیکھا تو عرض کیا، یارسول اللہ! آپؐ بے دھڑک خرچ کرتے رہیے اور عرش والے مالک سے کسی قسم کی کمی کا خوف نہ کیجیے۔ انصاری کی یہ بات چونکہ آپؐ کے دل کی آواز تھی، اس لیے سن کر تبسم فرمایا اور خوشی سے چہرہ کھل اٹھا۔ پھر فرمایا: ''ہاں! مجھے اسی چیز کا حکم دیا گیا ہے۔''(۲۳)

حضور ﷺ کے گھروں میں اکثر فاقوں اور اہل بیت کے کمال صبر وشکر کی متعدد روایات حدیث وسیرت کی کتابوں میں موجود ہیں، جن کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ ابن سعد نے ان فاقوں کی ایک وجہ بتائی ہے، جس کا بیان کرنا ضروری ہے۔ لکھتے ہیں:

حضرت ابوہریرہ ؓ (جنہیں دن رات حضور ﷺ کے قریب رہنے کا اتفاق ہوتا تھا)

نے بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ اکثر بھوکے رہتے تھے۔ سننے والے راوی اعرج نے دریافت کیا کہ اس بھوک کی وجہ کیا تھی؟ تو حضرت ابوہریرہ ؓ نے بتایا کہ:

لِکَثْرَۃِ مَن یَغشَاہُ وَ اَضیافِہ وَ قَومٍ یلزَمُوْنَہ لِذَا فَلا یَاکُل طَعَامٌ اَبداً اِلَّا مَعَہ اصحابُہ وَ اھلُ الحاجَۃِ یَتبعون مِنَ المسجد (۲۴)

''کثرت سے آپؐ کے ہاں آنے والے مہمانوں اور ان مفلس لوگوں کی وجہ سے جو کھانے کے لیے آپؐ کے ساتھ چمٹے رہتے تھے۔ آپؐ جب بھی کھانا تناول فرماتے تو آپؐ کے ساتھ آپ کے صحابہ اور وہ اہل حاجت بھی شریک ہوجاتے جو مسجد سے ہی آپ کے پیچھے آجاتے''---

حضور ﷺ کے ہاں مہمان نوازی میں اپنے، پرائے اور مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔ جو بھی مہمان کاشانۂ نبویؐ میں آتا، آپ ﷺ اس کی بھرپور خاطر تواضع فرماتے۔ حضور ﷺ کے اس بلند اخلاق، ایثار نفسی سے کفار ومشرکین متاثر ہوتے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتے۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا بیان ہے:

کَانَ رَسُولُ اللّٰہ ﷺ یَبِیتُ اللَّیَالِی الْمُتَتَابِعَۃَ طَاوِیًا وَ أَھْلُہُ لَا یَجِدُونَ عَشَاءً وَ کَانَ أَکْثَرُ خُبْزِھِمْ خُبْزَ الشَّعِیرِ (۲۵)

''رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے گھر والے متواتر کئی کئی راتیں بھوکے رہ جاتے تھے، کیونکہ رات کا کھانا میسر نہ ہوتا تھا، علاوہ ازیں جب کبھی روٹی میسر ہوتی تو اکثر جو کی روٹی ہوتی''---

اصحابِ صُفّہ ان فقراء ومساکین صحابہ کو کہا جاتا تھا، جن کا مدینہ منورہ میں کوئی گھر بار نہ تھا، نہ ہی انہیں گھر بار اور مال ومتاع کی چنداں خواہش تھی۔ دنیا کے نہ ہونے پر انہیں کسی قسم کا غم نہ تھا۔ وہ اپنے فقر اور عقبیٰ کی ان عظیم نعمتوں پر راضی تھے، جن کی حضور ﷺ نے انہیں خبر دی تھی۔ ہمہ وقت بارگاہ نبویؐ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنا، ان کا سب سے بڑا مشن تھا۔ ان ''اضیاف الاسلام'' کے لیے حضور ﷺ نے مسجد نبوی کے ایک کونے میں ایک سایہ دار چبوترہ بنوا دیا تھا، وہ اسی میں سوتے اور دن رات رہتے تھے۔ ان کے فقر وفاقہ اور افلاس کا یہ عالَم تھا کہ بعض اوقات کھڑے ہونے کی سکت نہیں رکھتے تھے اور دورانِ نماز ہی گر پڑتے تھے۔(۲۶)

حضرت ابوہریرہ ؓ جو خود بھی اصحابِ صُفّہ میں داخل تھے، اصحابِ صُفّہ کی تنگ دستی کا حال

بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے اصحابِ صُفّہ میں سے ایسے ستّر آدمیوں کو دیکھا ہے جن میں سے کسی ایک کے پاس بھی پوری چادر نہ تھی۔ ان کے پاس یا تو صرف تہ بند ہوتا تھا یا کمبل، جسے انہوں نے گردنوں کے ساتھ باندھ رکھا ہوتا تھا۔ وہ کمبل بعض حضرات کی نصف پنڈلیوں اور بعض کے ٹخنوں تک پہنچتا تھا۔ وہ کمبل کو اس خوف سے پکڑے رہتے تھے کہ کہیں ستر نہ کھل جائے۔ (۲۷)

جب تک فتوحات کا دروازہ نہیں کھلا تھا اور عام خوش حالی کا آغاز نہیں ہوا تھا، حضور ﷺ نے ان کی معاش کا یہ انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو بعض صاحب حیثیت صحابہ پر انہیں تقسیم فرما دیتے۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار اور بعض حضرات اس سے بھی زیادہ کو اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں کھانا کھلاتے۔ (۲۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ پھر بھی دس کے لگ بھگ جو آدمی بچ جاتے، حضور ﷺ ان کو اپنے کھانے میں شامل فرما لیتے۔ (۲۹)

دورِ نبویؐ پر پڑے ہوئے ان شیدایانِ اسلام اور فدایانِ رسولؐ کے متعلق حضور ﷺ کا اپنا عمومی رویہ یہ تھا کہ جب آپؐ کے پاس صدقہ کی قسم سے کوئی چیز آتی تو سب کی سب ان کی طرف بھیج دیتے اور خود اسے ہاتھ تک نہ لگاتے اور جب کوئی ہدیہ آ جاتا تو اس سے خود بھی تناول فرماتے اور اصحابِ صفہ کو بھی شریک کرتے۔ (۳۰)

اصحابِ صُفّہ کی اتنی خبر گیری کرتے کہ اپنے اہلِ بیت پر بھی ان کو ترجیح دیتے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں افلاس کا یہ عالَم تھا کہ گھر کا سارا کام کاج خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کو خود کرنا پڑتا تھا۔ چکّی خود پیستیں، پانی خود بھرتیں، کھانا خود پکاتیں، کپڑے خود دھوتیں، چھوٹے بچوں کے نہلانے دھلانے کا کام اس کے علاوہ تھا۔ مالی اعتبار سے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ سیدہ کو کم از کم ایک خادمہ ہی رکھ دیں۔ ایک مرتبہ مالِ غنیمت میں بہت سے غلام اور کنیزیں آئیں تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے سیدہ سے کہا:

حضور ﷺ سب لوگوں کو غلام اور کنیزیں عنایت فرما رہے ہیں، تم بھی ایک خادمہ کا مطالبہ کرو۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے درخواست پیش کی، تو فرمایا:

لَا أُعْطِيكُمْ وَ أَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تَلَوَّى بُطُونُهُمْ مِنَ الْجُوعِ (۳۱)

''ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کو دوں اور اہلِ صُفّہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ بھوک سے

ان کے پیٹ اکٹھے ہوئے جا رہے ہیں''---

زرقانی کی صراحت کے مطابق آپ ﷺ نے ساتھ یہ بھی فرمایا:

''بیٹی! میرے پاس ان اہل صفہ پر خرچ کرنے کو کوئی چیز نہیں، میں ان غلاموں کو فروخت کر کے یہ پیسہ ان فقراء پر خرچ کروں گا۔'' (۳۲)

بیٹی واپس چلی گئیں تو حضور ﷺ رات گئے دل جوئی کے لیے تشریف لائے اور فرمایا:

''بیٹی ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کی تسبیح کر لیا کرو، یہ خادم سے کہیں بہتر ہے۔'' (۳۳)

یورپ کو ناز ہے اس بات پر کہ اس نے کفالت عامہ (social security) کا تصور پیش کر کے عاجز و درماندہ اور محتاج انسانوں پر احسان کیا ہے۔ مگر شاید یورپ اور اس کے متاثرین یہ بھول گئے ہیں کہ یورپ نے اس کارِ خیر کا آغاز انیسویں صدی میں کیا اور اس کا سہرا برطانوی وزیر بیورج کے سر باندھتے ہیں۔ جس نے ۱۹۴۲ء میں بیورج رپورٹ پیش کر کے محتاجوں کو کچھ دینے کی اپیل کی تھی۔ مگر ہمارے نبی کریم ﷺ نے اس کارِ خیر کا آغاز اس زمانے میں کیا جب دنیا کفالت عامہ کے تصور سے ہی خالی تھی۔

حوالہ جات

(۱) القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۸، ص ۱۷۱

(۲) مقدمہ ابن خلدون

(۳) مشکوٰۃ المصابیح، ج ۳، ص ۱۳۹۲

(۴) بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام، از مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، ص ۱۲۹، ۱۳۰

(۵) ابن جوزی، سیرت عمر بن الخطاب، ص ۱۶۱

(۶) سنن النسائی الکبریٰ، ج ۴، ص ۷۶، رقم ۶۳۵۲

(۷) جامع ترمذی، باب ماجاء لانکاح الا بولی، ج ۳، ص ۴۰۸

(۸) سنن النسائی الکبریٰ، ج ۴، ص ۷۷، رقم ۶۳۵۷

(۹) امام غزالی، المتبر المسبوک، ص ۹۴

(۱۰) صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، باب اذا قال اکفنی مؤونۃ النخل، ج ۲، ص ۸۱۹، رقم ۲۲۰۰

(۱۱)صحیح بخاری'باب اخاء النبی بین المھاجر و الانصار'ج ۱'ص ۵۳۳
(۱۲)صحیح بخاری'باب مناقب عثمان'ج ۱'ص ۵۲۲
(۱۳)ابن عبدالبر'الاستیعاب'ج ۲'ص ۴۸۸
(۱۴)صحیح بخاری'باب الصلاۃ علی من ترک دینا'ج ۲'ص ۸۴۵'رقم ۲۲۶۹
(۱۵)صحیفہ ھمام بن منبہ'ج ۱'ص ۵۹
(۱۶)الھیثمی'مجمع الزوائد'ج ۱۰'ص ۳۲۵
(۱۷)سنن ابو داؤد'ج ۳'ص ۳۵'رقم ۲۹۴۹
(۱۸)صحیح بخاری'ج ۱'ص ۳۹'رقم ۷۱
(۱۹)شیخ عبدالحی کتانی'نظام الحکومۃ النبویۃ'ج ۱'ص ۲۴۱'۲۴۲'طبع بیروت
(۲۰)مشکوۃ المصابیح'باب الشفقۃ والرحمۃ علی الخلق'ص ۴۲۴
(۲۱)مسند احمد بن حنبل'ج ۲'ص ۳۳'رقم ۴۸۸۰
(۲۲)صحیح بخاری'ج ۵'ص ۲۲۴۴'رقم ۵۶۸۷
(۲۳)شمائل الترمذی مع جامع الترمذی'ص ۵۹۷-۵۹۶
(۲۴)ابن سعد'الطبقات'ج ۱'ص ۴۰۹
(۲۵)سنن الترمذی'ج ۴'ص ۵۸۰'رقم ۲۳۶۰
(۲۶)سمہودی'وفاء الوفاء'ج ۲'ص ۴۵۳
(۲۷)صحیح البخاری'کتاب الصلاۃ'باب نوم الرجال فی المساجد'ج ۱'ص ۶۳
(۲۸)طبقات ابن سعد'ج ۱'ص ۲۵۵
(۲۹)وفاء الوفاء للسمہودی'ج ۲'ص ۲۵۲
(۳۰)ابو نعیم اصفہانی'حلیۃ الاولیاء'ج ۱'ص ۳۴۱
(۳۱)مسند احمد بن حنبل'ج ۱'ص ۷۹'رقم ۵۹۶
(۳۲)زرقانی'شرح مواھب اللدنیۃ'ج ۴'ص ۳۲
(۳۳)مرجع سابق

مسلم معاشروں میں لڑکیوں کی بغاوت؟

اسباب وعلاج (۲)

ابوکلیم مقصود الحسن فیضی

تعمیری اقدامات

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۳) شادی کا حکم

شریعت نے اس سلسلہ میں تیسرا تعمیری قدم یہ اٹھایا ہے کہ جب بچے بالغ ہوجائیں تو گویا وہ شادی کے مرحلہ میں پہنچ چکے ہیں' اب ان کی شادی کردینی چاہیے' کیونکہ اوّلاً تو ایک شادی شدہ شخص' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' جب اپنے شریکِ حیات کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوگا تو اس کی جنسی شہوت قابو میں ہوگی۔ ثانیاً جب کبھی جنسی شہوت کا زور ہوگا تو اسے پورا کرنے کا حلال راستہ موجود ہوگا۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

((إِنَّ الْمَرْأَةَ تُقْبِلُ فِيْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ وَتُدْبِرُ فِيْ صُوْرَةِ شَيْطَانٍ ، فَإِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ اِمْرَأَةً فَأَعْجَبَتْهُ فَلْيَأْتِ أَهْلَهُ ، فَإِنَّ ذٰلِكَ يَرُدُّ مَا فِيْ نَفْسِهِ))(۱۱)

''عورت شیطان کی شکل میں سامنے سے آتی ہے اور شیطان کی صورت میں واپس جاتی ہے' اِس لیے اگر کوئی شخص کسی عورت کو دیکھے جو اسے متاثر کردے تو اپنی بیوی کے پاس

آکر اپنی ضرورت پوری کرلے' کیونکہ اس طرح اس کے نفس میں جو شہوت اُبھری ہے ختم ہوجائے گی۔''

ایک دوسری روایت میں ہے:

((إِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ اِمْرَأَةً فَأَعْجَبَتْهُ فَلْيَأْتِ أَهْلَهُ ، فَإِنَّ مَعَهَا مِثْلَ الَّذِيْ مَعَهَا))(۱۲)

''جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو دیکھے جس کا منظر اسے متاثر کردے تو اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس جائے' کیونکہ بیوی کے پاس بھی وہی چیز ہے جو اس عورت کے پاس ہے۔''

اس امر کی اہمیت کے پیشِ نظر شادی کے سلسلہ میں شریعت نے لوگوں کو تین ہدایات دی ہیں۔ آج انہی ہدایات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہمارا معاشرہ جنسی بے راہ روی کے دلدل میں پھنستا چلا جارہا ہے' اور میں سمجھتا ہوں کہ لڑکیوں کی بغاوت کی بھی بہت بڑی وجہ یہی ہے:

(۱) شادی کی ترغیب دی ہے اور بعض حالات میں اسے واجب قرار دیا ہے۔

(۲) شادی کے معاملات کو آسان سے آسان تر کرنے کی ترغیب دی ہے۔

(۳) بلوغت کے بعد سے لے کر عمر کی آخری سانس تک کسی عمر میں بھی شادی پر پابندی نہیں رکھی ہے۔

(۱) شادی کے بارے میں ترغیب سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَآئِكُمْ ۚ إِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝٣٢﴾ (النور)

''تم میں سے جو مرد اور عورت بے نکاح ہیں ان کے نکاح کردو' اور اپنے نیک بخت غلاموں اور لونڈیوں کے بھی۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کردے گا' اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔''

اللہ کے رسول ﷺ نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ! مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ ، وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ))(۱۳)

''اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں جو صاحبِ استطاعت ہو وہ شادی کر لے' کیونکہ شادی نظریں نیچی رکھنے اور شرمگاہ کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے' اور جس کے پاس شادی کرنے کی استطاعت نہ ہو اسے روزہ رکھنا چاہیے' یہ اس کی شہوت کے زور کو کمزور کر دے گا۔''

حدیث کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ شادی انسان کے لیے بدنگاہی (جو شہوت کی ابتدائی منزل ہے) اور زنا (جو شہوت کی آخری منزل ہے) سے بچاؤ کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہاں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ اسلام نے شادی کا حکم دیا ہے اور اس کی ترغیب بھی دی ہے' اور یقیناً شادی فواحش و منکرات کے انتشار کے سامنے مضبوط دیوار بھی ہے' لیکن اس موقع پر شریکِ حیات کے انتخاب سے متعلق چند خصوصی ہدایات بھی ہیں جن کا خیال کیے بغیر کبھی بھی میاں بیوی کا نیا جوڑا کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا۔

اوّل: دیندار اور اچھے اخلاق کے مالک ہوں' کیونکہ ماں باپ کے اخلاق و کردار کا اُن کے بچوں پر گہرا اثر پڑتا ہے' اس لیے شریک حیات کے انتخاب میں دینداری کو سرفہرست رکھا جائے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

((تخیروا لِنطفِکم' فأنکحوا الاکفاء' وانکحوا الیھم))(۱۴)

''اپنے نطفے کے لیے نیک عورت کا انتخاب کرو' ہم مرتبہ لوگوں سے رشتہ لو اور انہیں کو رشتہ دو۔''

اس حدیث کی شرح میں شارحینِ حدیث لکھتے ہیں کہ اپنے نطفے یعنی حصولِ اولاد کے لیے کسی پاک رحم اور صحیح اصل ہی کو تلاش کرو۔ لہٰذا نیک عورت کا انتخاب کرو اور فسق و فجور میں مبتلا عورتوں سے دور رہو۔ کیونکہ اگر عورت خود شریف زادی نہ ہوگی' تو اس کی خباثت بچوں تک ضرور پہنچے گی' اور اس کے بچے بھی بدکرداری کے ماحول میں پلیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ﴾ (النور:۲۶)

''خبیث عورتیں خبیث مَردوں کے لائق ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لائق ہیں' اور پاک عورتیں پاک مَردوں کے لائق ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لائق ہیں۔''(۱۵)

ایک دوسری حدیث میں مزید وضاحت ہے' فرمایا:

((تُنْکَحُ الْمَرْأَۃُ لِاَرْبَعٍ: لِمَالِھَا وَلِحَسَبِھَا وَجَمَالِھَا وَلِدِیْنِھَا' فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّیْنِ' تَرِبَتْ یَدَاکَ))(۱۶)

''چار صفتیں دیکھ کر عورت سے شادی کی جاتی ہے' اُس کی خوبصورتی دیکھ کر' اُس کا مال دیکھ کر' اُس کا حسب و نسب دیکھ کر اور اس کا دین دیکھ کر۔ تو تم دیندار عورت کو اختیار کرو' ورنہ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں۔''

اس حدیث میں بڑے واضح طور پر دیندار عورت سے شادی کرنے کا حکم ہے' کیونکہ فواحش و منکرات سے پاک معاشرہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد خوفِ الٰہی' تقویٰ اور حیاء و امانت داری پر رکھی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا' بلکہ مادیت پر نظر رکھی گئی تو لوگوں کے سامنے رسوائی و شرمندگی کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ ہوگا۔ زیر بحث حدیث کے جملہ ''تَرِبَتْ یَدَاکَ'' (تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں) میں شاید اسی طرف ایک باریک اشارہ ہے کہ اگر شریکِ حیات کے انتخاب میں دینداری اور صلاح و تقویٰ کو سامنے نہ رکھا گیا تو ہاتھوں میں مٹی کے علاوہ اور معاشرہ میں رسوائی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور پھر کسی کی دینداری کا فیصلہ اس کی ظاہری شکل و صورت کی بنا پر نہ کیا جائے بلکہ باقاعدہ اس کی تحقیق کی جائے' کیونکہ معاملہ ایک دن یا ہفتہ کا نہیں بلکہ زندگی بھر کا ہے۔ آج کی تھوڑی سی محنت باذن اللہ مستقبل کو محفوظ کر دے گی' ورنہ زندگی بھر کا پچھتاوا ہوگا۔

دوم: گھروں کو آباد کرنے اور مستقبل میں آباد رکھنے کے لیے بڑی اہم شرط یہ بھی ہے کہ شادیاں ہم پلّہ خاندان میں کی جائیں' یعنی لڑکے اور لڑکی کا جوڑ برابر کا ہو' کیونکہ بے جوڑ شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں' یا میاں بیوی دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک زندگی بھر اذیت و تکلیف کا شکار رہتا ہے۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی دینداری' تعلیمی معیار و مقام' خاندانی حیثیت' عمر اور مالی حالات میں ہم پلّہ ہوں یا کم از کم قریب قریب ضرور ہوں' ورنہ گھر آباد ہونے کی بجائے اجڑنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔

سوم: زمانے کی مادّی ترقی نے جہاں ہزاروں سہولتیں مہیا کر دی ہیں اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک بیماریوں کا تحفہ بھی دیا ہے۔ لہٰذا شادی سے پہلے اگر لڑکے لڑکی کا طبّی معائنہ کروا لیا جائے تو بہت بہتر ہے۔ اگرچہ ہمارے معاشرے میں یہ بات ناگوار محسوس ہوگی لیکن مستقبل میں اس

کے فائدے اور اہمیت سے انکار نہیں کیا سکتا۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے لڑکیوں کے سرپرستوں کو بھی یہی حکم دیا ہے کہ:

((اِذَا اَتَاکُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهٗ وَخُلُقُهٗ فَزَوِّجُوْهُ ، اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَکُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ))(۱۷)

''جب تمہارے پاس (تمہاری لڑکی کا ہاتھ مانگنے کے لیے) کوئی ایسا شخص آ جائے جس کے دین و اخلاق سے تم راضی ہو تو اس سے اپنی لڑکی کی شادی کر دو، اگر تم لوگوں نے ایسا نہیں کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا۔''

یعنی تمہاری نظر دین پر نہ رہی اور تم دنیاوی مفاد اور مادیت پر نظریں جمائے رہے تو بہت سی عورتیں اور مرد بے نکاح رہ جائیں گے، جس سے معاشرہ میں بے راہ روی، زنا بالجبر، جنس پرستی اور اغوا کے واقعات کثرت سے پیش آئیں گے اور آہستہ آہستہ معاشرہ قتل و غارت گری کا بازار بن جائے گا۔

آج کھلی آنکھ سے دیکھ کر عبرت حاصل کرنے والا ہر شخص مشاہدہ کر رہا ہے کہ جب سے مسلمانوں نے اس ارشادِ نبوی ﷺ سے روگردانی کی ہے اس وقت سے معاشرے میں ناجائز جنسی تعلقات، گھر سے فرار اور والدین سے بغاوت کے واقعات کثرت سے پیش آ رہے ہیں۔

(۲) شادی سے متعلق اسلام نے دوسری ہدایت یہ دی ہے کہ فضول خرچی اور غیر ضروری اخراجات سے پرہیز کیا جائے۔ زوجین یا ان کے سرپرستوں کو اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ ایک دوسرے سے ایسا مطالبہ نہ کریں جو اس کے لیے بوجھ ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((خَیْرُ النِّکَاحِ اَیْسَرُهٗ))(۱۸)

''سب سے زیادہ خیر و بھلائی کا حامل وہ نکاح ہے جو سب سے زیادہ آسان ہو۔''

ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اِنَّ مِنْ یُمْنِ الْمَرْاَةِ تَیْسِیْرُ خِطْبَتِهَا وَتَیْسِیْرُ صُدَاقِهَا وَتَیْسِیْرُ رِحْمِهَا))(۱۹)

''کسی عورت کی منگنی کا آسان ہونا، مہر کا ہلکا ہونا اور رحم کا آسان (۲۰) ہونا اس کے بابرکت ہونے کی دلیل ہے۔''

اس کے برعکس جس عورت کی منگنی اور شادی پر جس قدر زیادہ خرچ ہو، حمل اور ولادت کے مواقع پر پریشان کن ہوں وہ اس کے بے برکت ہونے کی دلیل ہے، جیسا کہ خود راوئ حدیث

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس کی صراحت کی ہے، چنانچہ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا: ''اور میں اپنی طرف سے کہتا ہوں کہ عورت کی منگنی کا مشکل ہونا، مہر کا زیادہ ہونا اور رحم کا مشکل ہونا اس کے بے برکت ہونے کی دلیل ہے۔''

ایک اور حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((اِنَّ اَعْظَمَ النِّکَاحِ بَرَکَةً اَیْسَرُهٗ مُؤْنَةً))(۲۱)

''سب سے زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے جو خرچ کے لحاظ سے آسان ہو۔''

آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ بطورِ خرچ شادی کے معاملے کے مشکل ہو جانے اور خرچ کا بوجھ (۲۲) بڑھ جانے کی وجہ سے کتنے ہی نوجوان ہیں جو غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور کتنی ہی جوان لڑکیاں ہیں جنھوں نے اپنے والدین اور خاندان سے بغاوت کر کے فرار اختیار کر لیا ہے، یا پھر ''کال گرل'' کا رول ادا کر رہی ہیں۔ علاوہ ازیں خفیہ عشق و معاشقہ، زنا، عمل قومِ لوط، سحاق (lesbianism) اور دیگر غیر اخلاقی امور و غیر فطری افعال ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں، اس میں بہت بڑا دخل شادی کے معاملے کا مشکل اور مہنگا ہونا ہے۔

(۳) شادی کے سلسلے میں شریعت نے تیسری ہدایت یہ دی ہے کہ اسلام میں بلوغت کے بعد شادی کے لیے کسی وقت اور عمر کی قید نہیں ہے، اور نہ ہی یہ کوئی شرط ہے کہ ایک بار تو شادی کر لی جائے لیکن چند سال کے بعد جب دو ایک بچے ہو جائیں اور بیوی کا انتقال ہو جائے یا کسی وجہ سے بیوی جنسی خدمت کے قابل نہ رہے تو دوبارہ شادی نہ کی جائے۔ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ اسلام نے شادی کے بارے میں کھلی آزادی دی ہے کہ حسبِ ضرورت و حاجت ہر شخص، خواہ وہ اپنی عمر کے کسی بھی حصہ میں ہو، شادی کر سکتا ہے، بلکہ اسے شادی کر لینی چاہیے، کیونکہ اس میں طرفین کی عفت و پاکدامنی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ شادی کے آداب و واجبات کو ملحوظ رکھا جائے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ ؕ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝۳۲﴾ (النور)

''تم میں سے جو مرد اور عورت بے نکاح ہیں ان کے نکاح کر دو، اور اپنے نیک بخت

غلاموں اور لونڈیوں کے بھی۔ اگر وہ مفلس ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے۔''

اس آیت میں ہر ایسے شخص کی شادی کر دینے کا حکم ہے جس کے ساتھ اس کا رفیقِ حیات نہیں ہے' خواہ وہ مرد ہو یا عورت' خواہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہو یا کنوارا۔ یہاں نہ تو کسی عمر کی قید ہے نہ ہی وقت کی' بلکہ ہر اُس شخص کے لیے شادی کا حکم ہے جو اس کا ضرورت مند ہو اور اس کے ساتھ اس کا رفیقِ حیات نہ ہو۔ مزید اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ فقر و غربت کو اس بارے میں حائل نہیں ہونا چاہیے' بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کر کے ہر صاحبِ حاجت کو یہ قدم اٹھا لینا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ شادی کی برکت سے اس کے فقر و فاقہ کو مال داری اور کشادگی میں تبدیل کر دے۔ ہماری اس بات کی تائید اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ:

((ثَلَاثٌ كُلُّهُمْ حَقٌّ عَلَى اللهِ عَوْنُهُ: اَلْمُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالنَّاكِحُ الْمُسْتَعْفِفُ' وَالْمُكَاتَبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الْأَدَاءَ))(۲۳)

''تین قسم کے لوگ وہ ہیں جن کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے: (۱) اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا' (۲) پاک دامنی کے مقصد سے نکاح کرنے والا' (۳) وہ مکاتب غلام جو اپنی قیمت ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔''

ہم اپنے اسلاف کی زندگی دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بارے میں بالکل ہی سادہ وارد ہوئے تھے' خصوصاً اس امت کا سب سے افضل حلقہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں نہ کوئی تکلف تھا اور نہ ہی شادی کے بارے میں کوئی حیا مانع تھی' نہ کسی عمر و وقت کا لحاظ رکھتے تھے' بلکہ حسبِ حاجت و ضرورت شادی کے لیے قدم بڑھا دیتے تھے' کیونکہ ان کے نزدیک اہم چیز اپنی عفت و عصمت اور دین کی حفاظت تھی' اس لیے ان کے یہاں بغیر کسی خاص مجبوری کے کسی شخص کا بغیر شادی کے زندگی گزارنا بڑے عیب کی بات سمجھی جاتی تھی' بلکہ ہر ایسا شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت جو قدرت کے باوجود شادی نہ کرتا تھا وہ مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

[۱] مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے شادی کر لی؟ میں نے جواب دیا: نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے

فرمایا: ''تمہیں چاہیے کہ تم شادی کر لو' کیونکہ اس امت کے سب سے افضل شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) سب سے زیادہ بیویوں والے تھے۔''(۲۴)

[۲] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ ''اگر میری عمر کا ایک دن بھی باقی ہو تو میں چاہوں گا کہ اس رات بھی میری کوئی بیوی ہو۔''(۲۵)

[۳] ابراہیم بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے طاؤسؒ نے کہا: ''تم شادی کر لو ورنہ میں تمہارے بارے میں وہی کہوں گا جو ابوالزوائد سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ تم نے شادی نہیں کی تو اس کا معنیٰ یہ ہے کہ یا تو مردانہ طاقت نہیں رکھتے یا پھر گناہ کرتے ہو''۔(۲۶)

کتبِ حدیث اور سلف کی سیرت و تراجم میں اس قسم کے اقوال کثرت سے پائے جاتے ہیں جن کے تفصیلی ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام میں بلوغت کے بعد شادی کے لیے کسی عمر و وقت کی قید نہیں' بلکہ سارا معاملہ حاجت و ضرورت اور استطاعت پر منحصر ہے۔

بدقسمتی سے ان واضح تعلیمات کے باوجود ہمارے یہاں لوگ دو اہم غلطیاں کرتے ہیں' جن کے نتیجہ میں معاشرہ بری طرح فحاشی و برائی کے دلدل میں پھنستا جا رہا ہے:

[۱] مرد و عورت کی شادی میں غیر معمولی تاخیر سے کام لیا جاتا ہے' چنانچہ اگر کوئی لڑکی بیس سال کی عمر میں اور لڑکا تئیس چوبیس سال کی عمر میں شادی کر لیتا ہے تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے شادی کرنے میں جلدی سے کام لیا ہے' بلکہ والدین عمومی طور پر اس عمر میں اپنے بچوں کی شادی کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔

قارئینِ کرام! اس تاخیر کا ایک منطقی' فطری اور واضح نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان خواہ مرد ہو یا عورت' اگر وہ شادی میں تاخیر کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی فطری ضرورت پوری کرنے کے لیے کوئی غلط راستہ اختیار کر رہا ہے' خواہ اس کی کوئی بھی صورت ہو' یا اپنی فطری ضرورت کو دبا کر صحت کا کباڑا کر رہا ہے' اور یہ دونوں ہی خطرناک ہیں۔

قارئینِ کرام! یہ میرا ذاتی خیال نہیں بلکہ غیر مسلم دانشور اور نوجوانوں کے معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بھی اس کا اقرار کرتے ہیں' چنانچہ مشہور ہندی اخبار ''دینک جاگرڑ''

جو ہندوستان کے متعدد شہروں سے شائع ہوتا ہے' اس کے ۲۸/اکتوبر ۲۰۰۶ء کے شمارہ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا ''دیر سے شادی''۔ اس مضمون کی لکھنے والی ایک خاتون ہیں جن کا نام ''بملا پاٹل'' مذکور تھا۔ اس مضمون میں دیر سے شادی اور اس کے اسباب سے متعلق اس خاتون نے بڑی قیمتی گفتگو کی ہے۔ دیر سے شادی کے متعدد اسباب کا ذکر کیا ہے' جن میں سے سب سے پہلا سبب یہ مذکور ہے کہ زیادہ نوجوان لڑکے لڑکیاں کم عمری میں جنسی تعلقات قائم کر چکے ہوتے ہیں' اور جب آزادی سے انہیں اپنی شہوت رانی کی جگہ مل جاتی ہے تو وہ شادی کے بندھن میں بندھنا کیوں گوارا کریں گے؟(۲۷)

[۲] شادی کے بارے میں دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مرد یا عورت چالیس سال کے قریب ہو اور اس کا شریکِ حیات وفات پا جائے تو اس کے لیے شادی کرنا بہت بڑا عیب سمجھا جاتا ہے' حتیٰ کہ خود اس کے ماں' باپ اور بھائی بند وغیرہ اسے پسند نہیں کرتے' جبکہ شادی سے بچنے کی وجہ سے بہت برے نتائج سامنے آتے ہیں' جن میں سے دو نتیجے بہت عام ہیں:

(۱) اخلاقی برائیوں کی کثرت' خاص طور پر مردوں کی طرف سے' چنانچہ بہو' بیٹی اور دیگر محارم کے ساتھ جنسی تعلقات کے جو گھناؤنے واقعات پیش آ رہے ہیں اگر آپ ان واقعات پر غور کریں تو عمومی طور پر آپ کو ایسے لوگ ملیں گے کہ زانی کی حالت بالعموم دو صورتوں سے باہر نہ ہوگی:

اوّل: اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس نے دوسری شادی نہیں کی۔

دوم: بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بیوی قربت نہیں چاہتی جبکہ خاوند میں قوت اور شہوانی تقاضا موجود ہوتا ہے۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے معاشرہ میں تعددِ زوجات ایک ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔

(۲) ذہنی الجھن اور نفسیاتی امراض۔

سچ فرمایا خالقِ کائنات نے:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الروم)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا

کیں تاکہ تم ان سے سکون پاؤ' اور اُس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔''

سعودی عرب کے مشہور اخبار ''الریاض'' میں جرمنی اور مصر کے تحقیقاتی شعبوں کے حوالے سے ایک رپورٹ چھپی ہے جس سے میرے سابقہ دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس تحقیق میں مذکور ہے کہ جو لوگ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں' خواہ مرد ہوں یا عورت' ان کی نفسیاتی صحت ان لوگوں کے مقابلہ میں کہیں اچھی ہوتی ہے جو اکیلے زندگی گزارتے ہیں۔ اس تحقیق میں مزید یہ بھی مذکور تھا کہ شادی جس قدر جلد کی جائے بلڈ پریشر' ہارٹ پرابلم اور دماغی بیماریوں کا احتمال اسی قدر کم ہوتا ہے۔(۲۸)

(جاری ہے)

حواشی

(۱۱) صحیح مسلم:۱۴۰۳' النکاح۔ سنن ابی داؤد: ۲۱۵۱' النکاح۔ مسند احمد: ۳۳۰/۳' بروایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ' الفاظ مسند احمد کے ہیں۔

(۱۲) سنن الترمذی:۱۱۵۸' الرضاع۔ سنن الدارمی: ۱۴۶/۲' بروایت ابن مسعود رضی اللہ عنہ' دیکھئے: الصحیحۃ:۲۳۵۔

(۱۳) صحیح البخاری:۵۰۶۶' النکاح۔ صحیح مسلم: ۱۴۰۰' النکاح' بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

(۱۴) سنن ابن ماجہ: ۱۹۶۸' النکاح۔ مستدرک للحاکم :۱۶۳/۲' بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ دیکھئے:الصحیحۃ:۱۰۶۷۔

(۱۵) فیض القدیر:۲۳۷/۳' مجموع' شروح سنن ابن ماجہ:۷۷۴۔

(۱۶) صحیح البخاری:۵۰۹۰' النکاح۔ صحیح مسلم:۱۴۶۶' النکاح' بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

(۱۷) سنن الترمذی:۱۰۸۴' النکاح۔ سنن ابن ماجہ:۱۹۶۷' النکاح۔ مستدرک الحاکم: ۱۶۴/۲' بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ' دیکھئے: صحیح الجامع:۲۷۰۔

(۱۸) سنن ابی داؤد:۲۱۱۷' النکاح۔ صحیح ابن حبان:۶۰۴۰' ۱۹۶/۶' بروایت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ دیکھئے: الصحیحۃ:۱۸۴۲۔

(۱۹) مسند احمد: ۷۷/۱۔ صحیح ابن حبان: ۴۰۸۲' ۲۰۸/۶۔ الطبرانی الاوسط:۳۶۳۷' بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا' دیکھئے: صحیح الجامع: ۴۴۲/۱۔

(۲۰) اس سے مراد حمل وولادت میں سہولت اور آسانی ہے۔

(۲۱) مسند احمد: ۸۲/۶۔ شعب الایمان للبیہقی: ۶۱۶۴‘ ۵۰۲/۸۔ النسائی الکبریٰ: ۴۰۲/۵‘ بروایت عائشہ ؓ۔ یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے‘ لیکن سابقہ دونوں حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے‘ اس لیے اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(۲۲) یہ ایسا موضوع ہے جس کے نقصانات کو آج معاشرہ کا ہر فرد محسوس کر رہا ہے اور حکومتی سطح پر بھی اس کے خلاف کوششیں ہو رہی ہیں‘ جیسے سعودی عرب میں بعض قبائل کے یہاں مہر کی رقم ایک متعینہ مقدار مقرر ہے کہ اس سے آگے نہیں بڑھایا جا سکتا‘ پاکستانی حکومت نے دعوتِ ولیمہ وغیرہ میں ون ڈش کی پابندی عائد کر دی ہے‘ وغیرہ۔ لیکن فی الواقع مسئلہ کا اصل حل یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ضمیر کو آواز دے اور معاشرے میں ایسی رسومات کی وجہ سے آنے والی خرابیوں کے نتائج پر توجہ دے تو اصلاح بہت آسان ہو سکتی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے‘ لیکن پھر بھی کسی کو تو پہل کرنی ہوگی۔ اگر اہلِ علم حضرات اور معاشرہ کے سرکردہ لوگ آگے بڑھیں تو کام آسان ہو جائے‘ کیونکہ عام لوگ تو چاہے نہ چاہے تقلید ہی کیا کرتے ہیں‘ مثال نہیں بن سکتے۔ داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے نصف صدی قبل شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں اتباعِ نبویؐ پر مبنی ایک اصلاحی تحریک کا آغاز فرمایا تھا‘ جس کے الحمدللہ خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ (نورانی)

(۲۳) مسند احمد: ۲۵۱/۳‘ سنن الترمذی: ۱۶۵۵‘ الجہاد۔ مستدرک الحاکم: ۶۰/۲‘ دیکھئے: صحیح الجامع ۳۰۵۲۔

(۲۴) صحیح البخاری: ۵۶۹۰‘ النکاح۔ سنن سعید بن منصور: ۱۳۹/۲۔

(۲۵) مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۲۹/۴۔ مصنف عبدالرزاق: ۱۷۰/۶۔

(۲۶) سنن سعید بن منصور: ۲۹/۱‘ ۴۹۱۔ مصنف عبدالرزاق: ۱۷۰/۶۔

(۲۷) دیکھئے: ’’دینک جاگرڑ‘‘ بروز سنیچر ۲۸/اکتوبر ۲۰۰۶ء ضمیمہ بنام سنگینی‘ ص ۱ و ۳۔

(۲۸) جریدۃ الریاض بتاریخ ۱۹/شعبان ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۲/ستمبر ۲۰۰۶ء کا آخری صفحہ۔

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

عتیق الرحمن صدیقی

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے حقیقی بندوں کی ایک خصوصیت یوں بیان فرمائی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿٦٤﴾﴾ (الفرقان)

''اور جو راتیں اپنے ربّ کے آگے سجدہ و قیام میں گزارتے ہیں۔''

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس آیۂ کریمہ کی تشریح اِن الفاظ میں کی ہے:

''اُن کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں' نہ ناچ گانے میں' نہ لہو ولعب میں' نہ گپوں اور افسانہ گوئیوں میں اور نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے ان معروف مشاغل کے برعکس یہ اس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حضور کھڑے' بیٹھے' لیٹے دعا اور عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ السجدۃ میں فرمایا: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ (آیت ۱۶) ''ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں' اپنے ربّ کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے رہتے ہیں۔'' اور سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا: ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿١٨﴾﴾ ''یہ اہل جنت وہ لوگ تھے جو راتوں کو کم ہی سوتے تھے اور سحر کے اوقات میں مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔'' اور سورۃ الزمر میں ارشاد ہوا: ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ﴾ (آیت ۹) ''کیا اُس شخص کا انجام کسی مشرک جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کا فرماں بردار ہو' رات کے اوقات میں سجدے کرتا اور کھڑا رہتا ہو' آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے ربّ کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہو؟''

(تفہیم القرآن' جلد سوم' الفرقان' حاشیہ ۸۱)

صاحبِ ضیاء القرآن رحمٰن کے بندوں کی اس صفت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب دنیا خوابِ راحت کے مزے لوٹ رہی ہوتی ہے تو وہ جاگ کر اپنے پروردگار کو یاد

کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے خالق کی ناراضگی کے خوف سے ان کی آنکھیں نمناک ہوتی ہیں' کبھی سجدہ ریز ہو کر اس کی پاکی اور کبریائی بیان کر رہے ہوتے ہیں اور کبھی ادب و تواضع کی تصویر بن کر دست بستہ اس کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی راتیں اسی حالت میں گزر جاتی ہیں۔ کسی کافر نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر میں چند راتیں اور چند دن بسر کیے اور جا کر اپنے بادشاہ کو بتایا ''هُمْ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ وَرُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ'' کہ وہ سارا دن برق رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھ کر دادِ شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت راہبوں کی طرح ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔'' (ضیاء القرآن' جلد سوم' الفرقان' حاشیہ ۶۳)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں:

''سُجَّدًا وَّقِيَامًا'' کے اسلوبِ بیان سے جو شوق و اضطراب نمایاں ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے' ظاہر ہے کہ اس سے صرف فرض نمازیں مراد نہیں ہیں بلکہ یہ تہجد کے سجود و قیام کی شب بیداریوں اور بے قراریوں کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی راتیں نہ عیش کدوں میں گزارتے ہیں اور نہ نرم و گرم بستروں میں دنیا و عاقبت سے بے فکر ہو کر سوتے ہیں' بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر عذابِ جہنم سے بچائے جانے کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔'' (تدبر قرآن' الفرقان)

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ ...﴾ (السجدۃ: ۱۶) کی توضیح کرتے ہوئے صاحبِ تفہیم القرآن لکھتے ہیں:

''ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ دن بھر اپنے فرائض انجام دے کر جب وہ فارغ ہوتے ہیں تو اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں' اس کی یاد میں راتیں گزارتے ہیں' اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اسی سے ساری امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ بستروں سے پیٹھیں الگ رہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ راتوں کو سوتے ہی نہیں ہیں' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ راتوں کا ایک حصہ خدا کی عبادت میں صرف کرتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن' سورۃ السجدۃ' حاشیہ ۲۷)

سورۃ الذّٰریات میں اہلِ تقویٰ کی اسی صفت کو یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿١٧﴾ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿١٨﴾﴾

''وہ راتوں کو کم ہی سوتے تھے' پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے۔''

صاحبِ تفہیم القرآن اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''مفسّرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ' کم یا زیادہ' ابتدائے شب میں یا وسط شب میں یا آخر شب میں جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباسؓ' انس بن مالکؓ' محمد الباقرؒ' مطرف بن عبداللہؒ' ابوالعالیہؒ' مجاہدؒ' قتادہؒ' ربیع بن انس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصہ اللہ جل شانہ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصریؒ' احنف بن قیس اور ابن شہاب زہری کا ہے..... یعنی وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق و فجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک انہیں نہ آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے ربّ کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی کا جو حق ہم پر تھا اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوئی۔'' (تفہیم القرآن' جلد پنجم' الذاریات' حاشیہ ۱۵' ۱۶)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے صالح' متقی اور برگزیدہ بندوں کے اس وصف خاص کا کہ ان کی راتیں اپنے ربّ کے آگے سجدہ و قیام میں گزرتی ہیں' متعدد بار ذکر فرمایا ہے۔ سجود و قیام کی یہ شب بیداری دراصل تہجد کی نماز ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن جلد پنجم میں ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ کے ضمن میں لکھا ہے کہ:

''لفظ تہجد ہجود سے مشتق ہے اور یہ لفظ دو متضاد معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی سونے کے بھی آتے ہیں اور جاگنے' بیدار ہونے کے بھی۔ اس جگہ ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ رات کے کچھ حصہ میں قرآن کے ساتھ بیدار رہا کرو' کیونکہ بِهٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے (مظہری)۔ قرآن کے ساتھ بیدار رہنے کا مطلب نماز ادا کرنا ہے' اسی رات کی نماز کو اصطلاحِ شرع میں نماز تہجد کہا جاتا ہے اور عموماً اس کا یہ مفہوم لیا گیا ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے وہ نماز تہجد ہے..... اور امام ابنِ کثیر نے حضرت حسن بصریؒ سے نماز تہجد کی جو تعریف نقل کی ہے وہ بھی اسی عموم پر شاہد ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: قال الحسن البصری ھو ما کان بعد العشاء ویحمل علی ما کان بعد النوم (ابن کثیر) ''حسن بصری فرماتے ہیں کہ نماز تہجد ہر اُس نماز پر صادق ہے جو عشاء کے بعد پڑھی جائے' البتہ تغافل کی وجہ سے اس کو کچھ نیند کے بعد محمول کیا جائے گا۔'' (سورۂ بنی اسراءیل' صفحہ ۵۱۵' ۵۱۶)

مختصراً تہجد کے معنی ہیں نیند توڑ کر اٹھنے کے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس سے وہ نماز مراد لی گئی ہے جو شب میں کچھ سونے کے بعد اُٹھ کر پڑھی جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے یہ نماز ضروری تھی' اس لیے آپ ﷺ نے عملاً اس کام پر مداومت فرمائی اور زندگی بھر اس کا اہتمام فرمایا۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

((اَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ الصَّلَاةُ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ))(۱)

''فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز درمیانی رات کی نماز (تہجد) ہے۔''

سورۂ بنی اسراءیل میں آیت کے پہلے حصے میں تہجد کا حکم دیا گیا ہے اور دوسرے حصے میں نبی اکرم ﷺ کو ''مقامِ محمود'' سے نوازے جانے کے شرف سے مشرّف کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾﴾

''اور (اے پیغمبر ﷺ!) رات کا کچھ حصہ (یعنی پچھلا پہر) شب بیداری میں بسر کرو' یہ تمہارے لیے ایک مزید عمل ہے۔ قریب ہے کہ تمہارا ربّ تمہیں ایک ایسے مقام پر پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ مقام ہو۔''

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو اوّل نماز تہجد کا حکم دیا گیا' پھر مقامِ محمود یعنی شفاعتِ کُبریٰ کا وعدہ کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز تہجد کو مقامِ شفاعت حاصل ہونے میں بڑا دخل ہے۔ (معارف القرآن' ص ۵۲۰) قتادہؒ فرماتے ہیں کہ: ''قیامت کے دن سب سے پہلے زمین سے حضور ﷺ باہر آئیں گے اور سب سے پہلے شفاعت آپؐ ہی کریں گے''۔ (ابن کثیر' بحوالہ تفسیر طبری)

حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جنت میں ایک اعلیٰ ترین درجہ مقامِ محمود ہے اور یہ مقام صرف ایک شخص کو دیا جائے گا۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ یہ مقام مجھے عطا کیا جائے گا''۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ''مقامِ محمود'' کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

''حسن و کمال کا ایک ایسا مقام جہاں پہنچ کر محمودیت خلائق کی عالمگیر اور دائمی مرکزیت حاصل ہو جائے گی۔ کوئی عہد ہو' کوئی ملک ہو' کوئی نسل ہو' لیکن کروڑوں دلوں میں اس کی ستائش ہو گی' اَن گنت زبانوں پر اس کی مدحت طرازی ہو گی۔ 'محمود' یعنی سرتاسر ممدوح ہستی ہو جائے گی۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل صوم المحرم۔

ما شئتَ قُل فیه ، فانتَ مُصدِّقٌ

فالحُبّ یقضی والمحاسن تشهد!

یہ مقام انسانی عظمت کی انتہا ہے۔ اس سے زیادہ اونچی جگہ اولادِ آدم کو نہیں مل سکتی۔ اس سے بڑھ کر انسانی رفعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کی سعی و ہمت ہر طرح کی بلندیوں تک اڑ کر جا سکتی ہے، لیکن یہ بات نہیں پا سکتی کہ روحوں کی ستائش اور دلوں کی مداحی کا مرکز بن جائے۔'' (تفسیر ترجمان القرآن، جلد دوم، ص ۳۹۶)

یہاں مقامِ محمود کی عظمت و رفعت نماز تہجد کی مناسبت سے بیان کی گئی ہے۔ یہ شانِ اقدس اس امر کی مقتضی تھی کہ رحمان کے بندے اس کو تقربِ الٰہی کے لیے اپنا وظیفہ بناتے اور مَن کی دنیا اجالنے کے لیے فکرمند رہتے۔ سورۃ المزمّل میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے رات کو نماز میں کھڑے رہنے کی تاکید کی ہے۔ نہ صرف فہمِ قرآن کے لیے اسے ضروری قرار دیا گیا بلکہ نبوت کے بارگراں کے حوالے سے بھی اس عمل کو ناگزیر بتایا گیا، فرمایا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ۝﴾ ''ہم تم پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں۔ درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر اور قرآن ٹھیک پڑھنے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔''

سیّد مودودیؒ نے ان مقامات کی نہایت خوبصورت اور جامع انداز میں توضیح فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن کو بھاری بھرکم کلام اس بنا پر کہا گیا ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا، اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا، اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا، اور اس کے مطابق عقائد و افکار، اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کرنا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔''
(تفہیم القرآن، سورۃ المزمل، حاشیہ ۵)

''درحقیقت رات کا اٹھنا نفس پر قابو پانے کے لیے بہت کارگر ہے'' کے مفہوم کی وضاحت میں چار جہتوں کو مبرہن کیا گیا ہے۔

i) یہ فعل ایک ایسا مجاہدہ ہے جو نفس کو دبانے اور قابو پانے کے لیے بڑی زبردست تاثیر رکھتا ہے۔ اس طریقے سے جو شخص اپنے آپ پر قابو پالے اور اپنے جسم و ذہن پر تسلّط حاصل کر کے اپنی اس طاقت کو خدا کی راہ میں استعمال کرنے پر قادر ہو جائے وہ زیادہ مضبوطی کے

ساتھ دینِ حق کی دعوت کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کام کر سکتا ہے۔

ii) یہ دل اور زبان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا بڑا مؤثر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کے ان اوقات میں بندے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا اور اس حالت میں آدمی جو کچھ زبان سے کہتا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔

iii) یہ آدمی کے ظاہر و باطن میں مطابقت پیدا کرنے کا بڑا کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ رات کی تنہائی میں جو شخص اپنا آرام چھوڑ کر عبادت کے لیے اٹھے گا وہ لامحالہ اخلاص ہی کی بنا پر ایسا کرے گا، اس میں ریاکاری کا سرے سے کوئی موقع ہی نہیں ہے۔

iv) یہ عبادت چونکہ دن کی عبادت کی نسبت آدمی پر زیادہ گراں ہوتی ہے اس لیے اس کا التزام کرنے سے آدمی میں بڑی ثابت قدمی پیدا ہوتی ہے۔ وہ خدا کی راہ میں زیادہ مضبوطی کے ساتھ چل سکتا ہے اور اس راہ کی مشکلات کو زیادہ استقامت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن، جلد ششم، المزمل، حاشیہ ۶)

قرآن و سنت کی ان توضیحات سے معلوم ہوا کہ تہجد کی نماز نفس کے تزکیہ و تصفیہ، تحسینِ ذات، روح کی بالیدگی اور نشوونما ارتقاء کے لیے نہایت ہی مفید، مؤثر اور کارگر نسخہ ہے۔ متخالف و متبارز اور نامساعد حالات میں عزیمت و استقامت اور صبر و ثبات کے ساتھ اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں تعلق باللہ کا توانا اور مضبوط ہونا ناگزیر ہے، آہِ سحرگاہی کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں کہ راہ کے سنگ ہائے گراں کو فرشِ قدم بنایا جا سکے ؎

عطارؔ ہو، رومیؔ ہو، رازیؔ ہو، غزالیؔ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی!

عام لوگوں کے لیے یہ نماز اگرچہ ضروری نہیں ہے، لیکن جو لوگ شیطانی قوتوں سے رزم آرا ہونے اور نظامِ حق کو برپا کرنے کے لیے اٹھے ہوں اُن کے لیے خدائی حمایت و نصرت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی نماز ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؎

میں نے پایا ہے اسے اشکِ سحر گاہی میں
جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش

❁❁❁

فائنانشل ایمرجنسی کا نفاذ ناگزیر ہے!

حافظ عاطف وحید

اس بات سے قطع نظر کہ کورونا کی عالمی وبا ایک واقعی اور قدرتی شئے ہے یا لیبارٹری میں تخلیق شدہ معاشی ہراسگی اور شیطانی ایجنڈے کا ایک خوفناک ہتھیار' ایک بات اس حالیہ تجربے سے عیاں ہے کہ جب حالات متقاضی ہوں تو بڑے بڑے اور ناممکن العمل فیصلے بھی ممکن' .... بلکہ ناگزیر ہو جاتے ہیں۔ عوام و خواص کو ہفتوں گھروں تک محدود کر دینا' معیشت کے پہیّے کو بیک جنبش قلم روک کر بدترین معاشی بدحالی کے عوامل کو برداشت کر لینا' ذرائع آمد و رفت پر اچانک ایسی بندشیں عائد کر دینا کہ جو شخص جہاں ہے وہیں تا اطلاعِ ثانی پھنس کے رہ جائے .... وغیرہ وغیرہ' ایسے فیصلے ہیں کہ جن کا پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا!

پاکستان سمیت کئی دیگر غریب ممالک نے اس وباء سے پیدا شدہ حالات کی بنا پر عالمی مالیاتی اداروں اور ترقی یافتہ اور مستحکم ممالک سے قرضوں میں رعایت اور سود کی معافی کا مطالبہ کیا ہے۔ بعض امیر ممالک اس مطالبے پر انتہائی سنجیدگی سے غور بھی کر رہے ہیں۔ یہاں ایک فطری سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کی معیشت پر قرضوں اور سُود کا اصل بوجھ تو داخلی ذرائع سے حاصل شدہ قرضوں کا ہے۔ بعض اَن کہی وجوہات کی بنا پر موجودہ مالیاتی سال میں داخلی قرضے بیرونی ذرائع کی نسبت کئی گُنا زیادہ شرح پر حاصل کیے گئے ہیں۔ ماضیٔ قریب میں ملکی بینکوں سے جو بلند شرح سود پر قرض حاصل کیا گیا ہے اسے ملکی معیشت پر تاریخ کا بدترین بوجھ قرار دیا گیا ہے' جس سے موجودہ حکومت تو دور کی بات ہے' آئندہ کی حکومتیں بھی اپنے جاری اخراجات پورا کرنے میں ناکام اور فلاحی منصوبے پس پشت ڈالنے پر مجبور رہیں گی۔ ایسے میں ''فلاحی ریاست'' کا دعویٰ ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

ہماری رائے میں اس صورتحال سے نکلنے کے لیے فائنانشل ایمرجنسی کا نفاذ ناگزیر ہے!

اور اس ایمرجنسی کا مرکزی نکتہ سودخوروں کے چنگل سے آزادی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوگا....؟ اس نکتے کی وضاحت سے پہلے چند حقائق ذہنوں میں تازہ کر لیجئے۔

(۱) قرآن سمیت ہر آسمانی کتاب نے سودخوری کو بدترین جرم اور گناہ قرار دیا ہے۔

(۲) حضرت محمد ﷺ سمیت ہر پیغمبر خدا نے سودخوری کا انجام معاشی اور اخلاقی تباہی بتایا ہے۔

(۳) ہر بڑے فلسفی و مفکّر بشمول ارسطو (۳۸۴ء ق م)' تھامس ایکویناس (۱۲۷۵ء)' ماٹن لوتھر (۱۵۴۶ء)' پوپ کلیمنٹ ۸ (۱۶۰۵ء)' جون ایڈمز (۱۸۲۶ء)' ابراہم لنکن (۱۸۶۵ء)' ایزرا ہیوووڈ (۱۸۹۳ء)' ہینری فورڈ (۱۹۴۷ء)' ایزرا پونڈ (۱۹۷۲ء)' اور جارج سٹیگلر (۱۹۹۱ء) وغیرہ' سب نے سود اور سودی نظام کو **تباہ کن' انسانیت سوز' معاشی سرطان اور شیطانی جال** قرار دیا ہے۔

(۴) علامہ اقبالؒ نے تو اس بارے میں یہ فرما کر کمال ہی کر دیا ہے ؎

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!
کس نہ داند لذّتِ قرضِ حسن
از ربا جاں تیرہ' دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

اور

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

(۵) جاپان اور دوسرے متعدد ممالک نے یہ راز جان کر کہ سود ایک ''ناسور'' ہے' اپنے ہاں شرح سود کو صفر تک بلکہ بعض کیسز میں منفی شرح تک گرا دیا ہے۔ اس تجربے سے ان کی معیشت میں نہ کوئی تباہی آئی اور نہ زلزلہ.... بلکہ انہیں معاشی استحکام اور ترقی نصیب ہوئی!

چنانچہ سوال یہ ہے کہ ہمارے وزیر اعظم صاحب عالمی مالیاتی اداروں اور غیر حکومتوں سے سود کی معافی کی توقعات وابستہ کرنے سے پہلے ملکی سُودخوروں اور سودی نظام کی جانب التفات کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ فساد کی اصل جڑ ہمارے داخلی سودی قرضے ہیں۔ لہٰذا بیان

کردہ حقائق کی روشنی میں ہماری تجویز ہے کہ ملک میں فائنانشل ایمرجنسی لگا دی جائے۔ اس معاشی پالیسی کے اہم اور بنیادی نکات یہ ہوں گے:

(۱) ایک سال کے لیے ملکی بینکوں سے حاصل کیے ہوئے قرضوں پر سود کی ادائیگی کو اُسی انداز اور عزم و جزم سے روک دیا جائے جیسے کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن جیسے سخت فیصلے کیے گئے۔ اس سے بجٹ میں جو خطیر رقم میسّر ہوگی اُسے ملک میں پیداواری صلاحیت میں اضافے کے لیے مختص کر دیا جائے۔ اُن صنعتوں کو خصوصی ترغیبات دی جائیں جو برآمدات بڑھانے کا ذریعہ بنیں۔

(۲) سود کی ہلاکت خیزی اور غلط پالیسیوں کی وجہ سے جو صنعتیں بند ہوگئی ہیں انہیں ازسرِنو آباد کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

(۳) ڈویلپمنٹ کے شعبے میں اخراجات کو بڑھایا جائے اور جاری اخراجات میں کمی کی جائے۔

(۴) آئندہ کے لیے سودی نظام کی حوصلہ شکنی کے لیے سود کے خاتمے کا ترمیمی بل پیش کیا جائے اور اسے بلاتاخیر پارلیمنٹ سے منظور کیا جائے۔ غیرسودی طریقوں کو رائج کرنے کے لیے ترجیحی بنیادوں پر قانون سازی کی جائے۔ یاد رہے کہ متبادل نظام کے خدوخال اور تفصیلات پر بیسیوں رپورٹیں لکھی جا چکی ہیں۔ کمی صرف قوتِ ارادی اور ایمانی جذبے کی ہے۔ یا دوسری وجہ سودی اداروں کے وہ vested interests ہیں جو سود سے نجات کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

(۵) متذکرہ بالا اقدامات کو قانونی سہارا دینے کے لیے فیڈرل شریعت کورٹ کے پاس اٹھارہ برس سے زیرالتواء انسدادِ سود کے مقدمے کے فیصلے کی راہ میں حائل نادیدہ رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔

(۶) سٹیٹ بینک، منسٹری آف فائنانس اور مانیٹری پالیسی کمیٹی سے ایسے عناصر کو بے دخل کیا جائے جو سودی نظام کی حمایت میں کمربستہ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ملک کو قرض کی دلدل میں مزید پھنسانے اور موجودہ حکومت کو ناکام بنانے کے لیے طویل مدّتی قرض کا حجم ۷۵۰۰ ارب سے بڑھا کر ایک ہی سال میں ۱۵۲۰۰ ارب تک پہنچا دیا۔ گویا اب تین سال تک حکومت کو اس اضافے پر ۱۴ فیصد کی شرح سے سود ادا کرنا

پڑے گا، جو کہ پاکستان جیسی معیشت کے لیے ہولناک معاملہ ہونے کے اعتبار سے تہتّر سالہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے! بقول غالبؔ:

قرض کی پیتے تھے مئے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

جناب وزیراعظم پاکستان! یہ چند باتیں نہایت اختصار کے ساتھ اور خالصتاً نیک نیتی کے جذبے کے ساتھ تحریر کی گئی ہیں۔ ضروری ہے کہ ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھتے ہوئے پورے عزم و ارادے کے ساتھ اور اللہ کی مدد کے بھروسے پر ابھی اور اِسی وقت یہ بڑا فیصلہ کر لیا جائے۔ سُود سے نجات میں ہی ہماری خیریت ہے۔ اور اگر ہم یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر، خاکم بدہن، ہمیں اور ہماری آئندہ نسلوں کو (خدائی تنبیہات اور زمینی حقائق کے عین مطابق) قحط، معاشی غلامی اور فتنہ و فساد سے بچانا ممکن نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے۔ آمین!

۞۞۞

اطلاع برائے قارئین

ملک بھر میں گزشتہ دو ماہ سے جاری لاک ڈاؤن کی وجہ سے ہمارے رسائل و جرائد کی اشاعت تعطل کا شکار رہی ہے۔ لہٰذا میثاق کا ماہ اپریل کا شمارہ شائع نہ ہو سکا اور اسے قارئین تک ''آن لائن'' ہی پیش کیا جا سکا۔ پیش نظر شمارہ کی حیثیت مئی اور جون کی مشترکہ اشاعت کی ہے۔ چنانچہ اس کی ضخامت میں بھی خاطر خواہ اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (ادارہ)

قرآن حکیم کی عظمت، تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآن حکیم اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ تقریباً 500 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

خود پڑھیے۔ دوسروں کو تحفہ میں دیجیے!

اشاعت خاص (مجلد):
امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 600 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):
امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 350 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-35869501-042

maktaba@tanzeem.org

June 2020
Vol.69

Regd. CPL No.115
No.6

Monthly Meesaq Lahore